

انفسکم لا یصر من اذ الله

# ملو علم



مئی ۱۹۳۸



ایک روپیہ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# طلوع اسلام

(دو درشانی)

کس روپے	سالانہ	مرتب	جلد
پرو روپے	ششماہی	مخدّیونس	
شمارک ۵	ایک روپیہ	قیمت فی جوب	
	بیک شتارک		

## فہرست

۵۳	طلوع اسلام پر ایک نظر	۱	عشرستان گودھرا
۶۳	اقبال اکادمی	۲	جب ہماری حکومت آئیگی تو.....
۶۵	مسلم لیگ کی تنظیم نو	۳	ذرا سوچئے!
۸۲	لیگ کو ختم کر دیا جائے	۴	پاکستانی مسکے؟
۹۶	آزاد پاکستان میں یو اقبال	۵	ملاح کی اصلاح
۱۰۶	صنم خانہ پندار (جناب آبدلتانی)	۶	۲۱ اپریل
۱۰۸	استفسادات	۹	لمحات
۱۱۱	اسران (ایک خط)	۳۳	قرآنی تعلیم (علامہ سلیم جیراچوری)
۱۱۲	جناح کیپ؟	۴۰	ی تو ان کردن (جناب عشرت)
۱۱۳	معاملہ کی ضروری باتیں	۴۱	سلیم کے نام..... (جناب پردیز صاحب)

# مخترستان گودھرا

ہندوستان کے اعمال سیاہ میں بہار مشرقی پنجاب، دہلی اور مغربی یوپی کے بعد گودھرا کا اضافہ ہوا ہے۔ احاطہ بمبئی کا یہ ہندو شہر جس میں ۲۵ مارچ ۱۹۴۷ء تک تیس ہزار گھر گوبستے تھے، آج اذان کی آواز کو بھی ترس با ہے۔ حکومت بمبئی کے سرکاری اعلان کے مطابق سندھ سے گئے ہوئے غیر مسلم پناہ گزینوں نے ایک جلوس نکالا، ہلالی پرچم کو اتار کر پھاڑ ڈالا اور ایک مسجد کی چھتی کی۔ اس کے ساتھ ہی مسلح ہندوؤں نے مقامی سول حکام اور فوج کی موجودگی میں اور ان کی عملی امداد سے شہر کو گھیر لیا اور بے بس اور نیتے مسلمانوں کو قتل کرنا، ان کی جائیدادوں کو لوٹنا اور ان کے مکانات کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ مسلح کے کلکٹر نے مسلم کشی کی اس جہم میں نمایاں حصہ لیا جن مسلمانوں نے اپنے عزیزوں کی جانیں بچانے کی کوشش کی انہیں گولی مار دی گئی۔ ہزاروں مسلمانوں کو آگ کے بھڑکتے ہوئے شلوں میں پھینک کر بھون ڈالا گیا۔

۳۰ مارچ کو احمد آباد سٹی کانگریس کمیٹی کے سیکریٹری سٹراجرن لال اور دوسرے کانگریسی کارکنوں نے گودھرا سے واپسی پر بتایا کہ گودھرا شہر عملی طور پر خاکستر ہو چکا ہے۔ آگ کے شعلے چودہ چودہ میل سے نظر آ رہے تھے۔ اسی تاریخ کو احمد آباد کے ایک گجراتی روزنامہ سندھیش نے ایک اطلاع شائع کی کہ فساد سرحدی ملاقوں، ٹھہرے ریاستوں اور لوہا دیہات تک پھیل چکا ہے

۳۱ مارچ کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے نمائندہ نے گودھرا کا دورہ کرنے کے بعد اطلاع دی کہ اس وقت تک پچیس ہزار پریشان روزگار مہاجر یا ہرجا چکے ہیں۔ گودھرا میں ساڑھے تین ہزار مکانات جل چکے ہیں۔ ایک مرہٹہ سپاہی نے، جو گذشتہ جنگ عظیم میں آئی میں ہلاکت آفرینی و قباہ کاری کے مناظر دیکھ چکا تھا، اس نمائندہ سے کہا۔

"میں نے اس قسم کی تباہ کاری دشمن کے بمباروں سے بھی نہیں دیکھی" گودھرا میں یہ قیامت برپا تھی اور حکومت پاکستان خاموش تھی۔ بارے ۸ مارچ کو، یعنی پورے پندرہ روز کے انتظار کے بعد، تئی دہلی سے یہ خبر آئی کہ پاکستان کے کئے ہوئے ہائی کمشنر الہ آباد کو بلا لیا گیا۔ ہوائی جہاز گودھرا جا میں گئے۔

اپریل ہندو شہر ہے۔ بلار سیدگان گودھرا پاکستانی ہائی کمشنر کی کارگزاری کی تفصیل سننے کا بیابان انتظار کر رہے ہیں۔ تازہ خبروں کے مطابق دہلی پھر گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ یہ سطور پریس میں بھیجنے تک حکومت پاکستان پرستور خاموش ہے۔

# جب ہماری حکومت آئیگی تو.....

رات کا سناٹا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ گھوڑا قدم قدم چل رہا تھا۔ گاڑی بان بھی اودھکھ رہا تھا۔ میں نے فضا کے سکوت کو توڑتے ہوئے یونہی گاڑی بان سے کہا۔

کہو میاں! اب تو تمہاری حالت بہتر ہو گئی ہوگی!

گاڑی بان چونکا اور عجیب سی بے رنجی سے بولا۔ بابو صاحب! محض تم لوگوں کے یہاں آجانے سے ہماری حالت میں کیا فرق پڑے گا۔ پہلے بھی یہی مزدوری کرتے تھے جو اب ہے۔ سنا تھا کہ اب مقرب مسلمانوں کی اپنی حکومت آجائگی اس وقت البتہ ہماری حالت میں بھی فرق آجائے گا۔ لیکن معلوم نہیں وہ حکومت کب تک آئیگی۔ چھ مہینے سے ایسا ہی سننے آرہے ہیں۔

میں نے کہا۔ میاں! وہ حکومت تو چھ مہینے سے آچکی ہے۔ نہیں خبری نہیں ہوئی۔

اس نے حیرت سے میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہا۔ کیا کہا با بوجی آپ نے؟ چھ مہینے سے ہماری حکومت آچکی ہے؟ یہاں تو وہی لائسنس کلرک ہے۔ وہی اس کی جھڑکیاں اور وہی اس کے تقاضے۔ وہی پولیس ہے اور وہی ان کی بیگار اور وہی گا لیاں۔ وہی تیل کی مصیبت۔ وہی دلنے اور گھاس کی دقت۔ ہماری اپنی حکومت ہوتی تو ہماری جیتا کیسے رہتی؟

میں اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔

اور اس کا جواب دے بھی کون سکتا تھا!

سے وہ کہ جن کی زبانوں پر ہزار مرتبہ لفظ جمہوریت آنے کے باوجود ان کا دل ایک بار بھی اس کی گواہی نہیں دے سکا۔ اُسے دل کے کانوں سے سن رکھیں کہ یہ لفظ کبھی شرمندہ معنی نہ ہو گا جب تک ایک گاڑی بان تک بھی یہ محسوس نہ کر لے لگے کہ اس کی حالت میں فی الواقعہ فرق پیدا ہو گیا ہے۔

اور یاد رکھئے! یہ تبدیلی احوال نہ اس ذہینتہ سے ہوگی جو انگریزی کی طرف سے پاکستان کیلئے

متہیں مل گیا ہے۔ اور نہ اُن قوانین و ضوابط سے جو تم مشین کی طرح نافذ کرنا چاہتے ہو۔

بلکہ یہ تبدیلی اُس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک تمہارے اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ ہو جائے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِكُمْ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

دقیقاً خدا کبھی کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک اپنے اندر نفسیاتی

انقلاب پیدا نہ کرے!

کا ہی مفہوم ہے۔

## ذرا سوچیے!

کسی بڑے سے بڑے آدمی سے کہئے کہ اس کا جوتا ٹوٹ گیا ہے، چار ٹانگے لگالے۔ وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ جوتا سوچی کے پاس لے جائیے۔

مشق۔ کسی قابل سے قابل آدمی سے کہئے کہ پیٹ میں درد ہو رہا ہے، وہ کہے گا کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔

ڈاکٹر سے مشورہ کرو۔

کسی لائق سے لائق انسان سے پوچھئے کہ تقسیم جائداد کا جھگڑا ہے میں کیا کروں۔ وہ کہہ دیگا کہ کسی قانون دان وکیل کے پاس جاؤ۔

غرضیکہ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جس کے متعلق کوئی یہ نہ کہے کہ میں اس کا اہل نہیں لیکن حکومت کی کرسی کسی شخص کو سپین کر دیجئے کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں اس کا اہل نہیں۔ اس کیلئے کسی ایسے شخص کی تلاش کیجئے جو اس کی قابلیت رکھتا ہو۔

یعنی دنیا میں جو تاکہا ٹھٹھنے تک کے لئے کسی قابلیت کی ضرورت ہے، لیکن حکومت کے لئے نہ کسی اہلیت کی ضرورت ہے نہ قابلیت کی۔ نہ استعداد کی شرط ہے نہ موزونیت کی۔ یہ وہ کرسی ہے جس پر بیٹھنے کیلئے ہر شخص تیار ہے۔ اور تیار ہی نہیں بلکہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد چھتا یہ ہے کہ اس سے زیادہ اس کے لئے کوئی اور موزوں ہی نہیں۔

حالانکہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام حکومت ہے۔ کسی انسان کا، دوسرے انسان کے معاملات میں حکم ہونا اور ان کے اختیار و ارادہ پر پابندیاں عائد کرنا۔ یہ تو چھوٹے راجے کی خدائی ہے۔ لیکن سوچی بننے کے لئے تو کسی استعداد کی شرط ہے۔ اس خدائی کے فرائض سرانجام دینے کے لئے کوئی شرط نہیں۔

# پاکستانی مسکے

بچپن میں ایک داغخانہ تفتہ سنا کرتے تھے کہ جب حضرت نوح اپنے متبعین کو ساتھ لے کر کشتی میں سوار ہو گئے اور کفار سے کہدیا کہ آج اس طوفان بے پناہ سے کسی کو چاہا نہیں مل سکتی تو انہوں نے ہویکھا کہ کفار بڑے بڑے ٹکے لئے اور انہیں پانی میں ٹھیل کر ان پر تیرنا شروع کر دیا۔ اس سے حضرت نوح کو سخت قلق ہوا اور انہوں نے بدگاہ رب العزت صفا مانگی۔ اس پر انڈیا نے سخت میز آمدھی چلا دی جس سے وہ ٹکے آپس میں ٹکرائے اور ٹوٹ گئے۔ امان کے سہارے تیرنے والے، سیلاب میں غرق ہو گئے۔

یہی نظارہ ہمیں سندھ اور پنجاب میں دکھائی دیرہا ہے۔ ایک طرف پنجاب کے وزیر اور اکابرین حضرات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ دوسری طرف سندھ میں وزیر عظمیٰ اور دیگر وزراء کے ٹکے ایک دوسرے سے ٹکریں لے رہے ہیں اور سیلاب بلا کی طغیانیاں ان پر نہیں رہی ہیں کہ اس قسم کے سہارے پکڑنے والوں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ اور دوسرے ایک آٹے پکار کر کہہ رہی ہے کہ

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ تَبْيُثِّتِ عَلَيْكُمْ عَذَابَ آيَاتِنَا فَوَيْلٌ لَّكُمْ إِذْ مِمَّن تَحْتِ أَنْ تَجْلِبُوا  
أَوْ يُلْبِسَكُمْ شِيْعًا وَيَخْتَارُ لَيْتَ بَعْضُكُمْ يَأْسُ بَعْضًا وَيَتِي

اللہ اس پر قادر ہے کہ تم پر آسان سے عذاب نازل کر دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم پارٹی بازی میں الجھ جاؤ اور اس طرح تم ایک دوسرے سے ٹکرانے لہنؤ

# ملاح کی اصلاح!

ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کشتی میں چھید کیوں کرتے ہو؟

کشتی میں چھید کیوں کرتا ہوں؟ پچاس دفعہ اس ملاح سے کہہ چکا ہوں کہ تم نے بادبان غلط بانڈھا ہے۔ کشتی، سمت ساحل نہیں جا رہی، اس کا رخ سیدھا کر دو۔ لیکن یہ سنتا ہی نہیں۔ اب جو کشتی بیکار ہوگی تو پتہ چلے گا!

ارے پاگل! کشتی میں چھید کرو گے تو کشتی کے ساتھ خود بھی ڈوبو گے۔ ملاح کو تنبیہ کا یہ کونسا طریق ہے۔ اگر تم میں سے کوئی ناخداغی جاننے والا ہے تو ملاح کے ہاتھ سے چھو پھین لو اور کشتی کا رخ سیدھا کر دو۔ لیکن کشتی کو سلامت رکھو جس کی سلامتی میں تمہاری سلامتی ہے پاکستان کے موجودہ راجا حکومت و اقتدار کی اصلاح کی فکر کرنے والوں کو ہر وقت یاد رکھنا چاہئے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو خود مملکت پاکستان کی کمزوری کا باعث بن جائے کہ اس کشتی کے رخدا نکر وہ) ڈوبنے سے ہم سب غربی قریب لیت جو جائیں گے۔ ملاح غلط کار ہے تو اس کے ہاتھ سے چولے کر بہترین ہاتھوں میں دید کیجئے۔ لیکن کشتی میں چھید نہ کرنے بیٹھ جائیے کہ دشمن ہر وقت گھات میں ہے۔

# ۲۱ اپریل

ہم نے مارچ کے طلوعِ اسلام میں حکومتِ پاکستان کی توجہ اس اہم فریگڈاشت کی طرف مبذول کرائی تھی کہ ۱۹۴۸ء کی تعطیلات کی فہرست میں یومِ اقبال (۲۱ اپریل) کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اپریل کے شمارہ میں دوبارہ یاد دہانی کرائی گئی۔ اس پر حکومتِ پاکستان کی وزارتِ داخلہ نے طلوعِ اسلام کے نام ایک مکتوب میں جو عذر پیش کیا ہے اور اس کا جو جواب طلوعِ اسلام نے دیا ہے، وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ دونوں مکتوبات قوم کے سپرد ہیں۔ اب وہی اس پر تبصرہ کر سکتی ہے، ہماری طرف سے مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں۔

مکتوب انڈسٹریل سیکرٹری حکومتِ پاکستان

"مجھے یہ کہنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی مرکزی حکومت کے دفاتر میں تعطیلات کی فہرست پورے غور و خوض کے بعد، کابینہ کی منظوری سے، شائع کی گئی تھی۔ اس فہرست میں مزید اضافہ اور ڈاکٹر محمد اقبال کے یومِ وفات پر ۲۱ اپریل کو تعطیل عام کا اعلان کرنا بہت بعد از وقت ہے۔ ہاں اس بات کو نوٹ کر لیا گیا ہے اور جب ۱۹۴۹ء کے لئے تعطیلات کا عام مسئلہ زیرِ غور آئیگا، اس پر مناسب غور کیا جائے گا۔"



مرتب کرتے وقت یہ دیکھئے کہ اس میں اس قدر اہم تقریب کی فروگذاشت نہ ہو جائے۔ اس فروگذاشت کی طرف ہم نے اوائل مارچ میں آپ کی توجہ منعطف کرائی۔ پھر طلویع اسلام کی اپریل کی اشاعت میں دوبارہ یاد دہانی کرائی گئی۔ اس کے باوجود عذر یہ پیش کیا گیا ہے کہ اب بہت دیر ہو گئی ہے اس لئے ۱۲ اپریل کی تعطیل نہیں سائی جاسکتی۔ حالانکہ آپ کی اس چٹھی کی تاریخ اور یوم اقبال میں قریب ایک ہفتہ کا فصل باقی ہے۔ قوم ابھی اس چیز کو بھی نہیں جھوٹی کہ ابھی گل کی بات ہے، ہندوؤں کے قومی راہنما مسٹر گاندھی کے قتل کی خبر دفاتر بند ہونے کے بعد پہنچی تھی اور دوسرے دن حکومت پاکستان کے دفاتر میں تعطیل تھی اور اس تعطیل کا اعلان رات کے نو بجے ریڈیو پر ہو گیا تھا۔ وہ فیصلہ تین گھنٹے میں ہو گیا تھا لیکن پاکستان کے تصور کے بانی، ملت اسلامیہ کے محسن اعظم، قوم کی نشاۃ ثانیہ کے ذمہ دار کے یوم وفات کی تعطیل کا فیصلہ آٹھ مہینے میں بھی نہیں ہو سکا۔

آپ کا زیر نظر مراسلہ ۱۶ تاریخ کو لکھا گیا ہے۔ گاندھی کی چٹھی کا فیصلہ کرنے میں جتنے گھنٹے لگے تھے اس تاریخ سے یوم اقبال تک اس سے دو گنے دن باقی تھے۔ حکومت چاہتی تو اس عرصہ میں مناسب فیصلہ کر سکتی تھی۔ بہر حال اقبال لائبریری شہرت کا مالک ہے۔ اس کی یادان ذرائع کی محتاج نہیں۔ اس سے فقط احسان شناسی کے جذبہ کا اظہار مقصود تھا۔ دینائے تشکر و ائمان میں حکومت پاکستان کی یہ احسان فراموشی کس نگاہ سے دیکھی جائے گی اس کا فیصلہ آنے والی نسلیں کریں گی۔ اگر ہندو یا انگریز کی حکومت میں یہ فیصلہ ہوتا تو ہم مسلمانوں کے سامنے اس کا گلہ کرتے۔ اب تو ہمیں یہی حیرت ہے کہ اس کا گلہ کس سے کریں۔

اس چٹھی کے بعد ہمیں مایوسی کا اطمینان ہو گیا تھا کہ ۳۰ اپریل کی شام کو اچانک ہمارے ایک دوست آئے جن کی تعقید میں ہنس کی طرح تند و تیز ہوا کرتی ہے۔ گھبرائے ہوئے سے کہنے لگے: تمہیں کچھ معلوم ہوا۔ حکومت پاکستان کے محکمہ امور داخلہ میں ابھی ابھی لاہور سے ٹیلی فون آیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال انتقال فرما گئے۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ چنانچہ ارباب حکومت نے اس خبر کے سنتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ کل دفاتر بند رہیں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی مہنسی ضبط نہ کر سکے۔ بعد ازاں ہمیں بہاری چٹھی مورخہ ۱۹ کے جواب میں ذیل کا خط موصول ہوا۔

نمبر ۱۶ پبلک - محکمہ امور داخلہ - مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۷ء

آپ کی چھٹی نمبری ۶۲ مورخہ ۱۹ اپریل کے جواب میں تحریر ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد، ۲۱ اپریل ۱۹۴۷ء علامہ اقبال کی پہلی برسی کا دن ہو گا۔ حکومت مرکزیہ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ نظریہ پاکستان کے لئے مرحوم کے بے مثال عطایا کی یاد میں اس دن تمام دفاتر بند رہیں گے۔

ہم حکومت پاکستان کے محکمہ امور داخلہ کے ارباب بست و کشاد کے نہایت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے یہ بتایا کہ حصول پاکستان کے بعد، ۲۱ اپریل ۱۹۴۷ء علامہ اقبال کا پہلا یوم وفات ہے، ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ فرمایا ہے۔ حکومت بہر حال حکومت ہے۔ اس کے ذرائع خبر رسانی بہت وسیع ہوتے ہیں۔ دنیائے ہزار کوشش کی گئی راز کسی پر فاش نہ ہونے پائے کہ ۲۱ اپریل ۱۹۴۷ء، آزاد پاکستان میں علامہ اقبال کی برسی کا پہلا دن ہے۔ لیکن حکومت کے سرانجاموں نے اس کا پتہ لگا ہی لیا۔

بڑی مشکل سے ہوتے ہیں جن میں دیدہ و درپیدا۔

کہتے ہیں کہ کوئی عرب مجرم کے بیٹے لکھنؤ آنکلا۔ لوگوں کو ماتم کرتے دیکھا تو پوچھا کہ کیا بات ہے کسی نے بتایا کہ یہ لوگ حضرت امام حسین کی شہادت پر ماتم کر رہے ہیں۔ ہیرت سے کہنے لگا کہ۔ اچھا! یہاں اب خبر سنی ہے۔

۲۰ اپریل کی چھٹی بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ حکومت پاکستان کے محکمہ امور داخلہ میں حضرت

علامہ کی وفات کی خبر کا دل دس برس کے بعد سنجی۔

یہ ہے ہماری مرکزی حکومت کے ارباب حل و عقد کا حال۔ ہمیں یقین ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زمانہ کے زمانہ میں بھی کوئی ایسی فکر و نظر اور بد سلیقگی کا اس سے بدتر نمونہ کبھی نہ پیش ہوا ہو گا۔ ۱۶ اپریل کی چھٹی دیکھتے اور اس کے بعد اسی محکمہ اور انہی صاحب کے دستخطوں سے، ۲۱ اپریل کی۔ اور پھر دیکھتے اس قوم کی سمت پر جس کے کارپردازان اس ماتم کے واقع ہوئے ہوں۔

# معا

## پاکستان کا نظام حکومت شریعتِ اسلامی کے مطابق ہونا چاہئے

یہ ہے وہ آواز جو تحریک حصولِ پاکستان کے زمانہ میں بھی بلند ہو کر ہر قلبِ حساس کیلئے وجہِ نشاطِ روح ہوتی رہی اور اب تشکیلِ پاکستان کے بعد ہر در و دیوار سے اٹھ کر باعثِ طمانیت جان ہو رہی ہے۔ حصولِ پاکستان کی تحریک سے ہماری وابستگی ذمائیہ اور اب تشکیلِ پاکستان کے بعد اس کے نظام و استبقار کے لئے ہماری دعائیں اور تمنائیں، محض اس لئے ہیں کہ ہمیں اس سے اسلامی نظامِ معاشرت و حکومت کے تیام کے امکانات حاصل ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ چاروں طرف سے یہ آواز تو بلند ہو رہی ہے مگر کہیں سے یہ سننے میں نہیں آتا کہ وہ اسلامی نظامِ جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ بالآخر ہو گا کیا؟ قومِ مطالبہ پر مطالبہ کئے جا رہے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ ہونا چاہیے اور حکومت کے بنائے دے وعدہ پر وعدہ کئے جا رہے ہیں کہ تم کیوں گھبر رہے ہو۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ بالآخر وجہِ اضطراب کیا ہے؟

ڈالا ہے تم کو دہمنے کس پیچ و تاب میں!

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ ان کی طرف سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہم کیا مانگتے ہیں۔ اور نہ ان کی طرف سے اس کی صراحت کہ اس وعدہ کی تجسیمی صورت کیا ہوگی۔ بس! آوازیں ہیں کہ اُدھر سے بھی اٹھ رہی ہیں اور اُدھر سے بھی۔ آئیے! فدا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ

مطالبہ کرنے والوں کے ذہن میں عام طور پر کیا کچھ ہے اور وعدہ کرنے والے اسے کیا سمجھ رہے ہیں اور اصل حقیقت کیا ہے؟

جہاں تک مطالبہ کرنے والوں کا تعلق ہے، ان میں سے عوام بچاروں کو تو نہ کبھی پتہ ہوا ہے اور نہ اب ہے کہ ہم سے کیا کہلوایا جا رہا ہے۔ ان کے ذہن میں نظام شریعت سے مفہوم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عید، بقرہ، حجاج، شبِ براءت سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اگر اربابِ حکومت، ڈاڑھیاں بڑھالیں، لیس ترضوالیں، نمازیں پڑھنا شروع کر دیں اور اسلامی تہولوں پر جشن کا انتظام کر دیا کریں تو ان کا مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ ان سے آگے بڑھے تو اربابِ شریعت کا طبقہ آتا ہے۔ یہاں ایک اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اہل تشیع میں سے ہیں تو ان کے نزدیک اسلامی شریعت حقہ کچھ اور ہوگی۔ پھر سنی حضرات میں سے، اہل حدیث کے نزدیک شریعت نام ہوگی ان تمام جزئیات و تفصیلات کے مجرہ کا جو کتبِ روایات میں مذکور ہیں۔ اور اگر وہ اہل فقہ ہیں تو شریعت نام ہوگا ان تمام فقہ و اہل فقہ کا جو ائمہ فقہ نے اپنے اجتہادات سے وقتاً فوقتاً صادر فرمائے۔ اور ان سب کے باہمی اختلافات و بلکہ مخالفت کا یہ عالم ہے کہ ایک کے نزدیک، دوسرے کی شریعت، اسلامی نہیں اور دوسرے کے نزدیک تیسرے کا نظام شرعی نہیں۔ ہزار برس سے ان میں باہمی تفساد و مخالفت چلا آ رہا ہے، جو رفتہ رفتہ مستقل مذاہب کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس اختلاف کی بنا پر باہمی ممانعت و مخالفت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دوسرے کو دیکھ تک نہیں سکتا۔

یہ ہے پاکستان میں نظام شرعی کی تنفیذ کا مطالبہ کرنے والوں کی حالت۔



اب دوسری طرف وعدہ کرنے والوں کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے نزدیک مذہب، تقدامت پرستی کی دلیل اور تاریک خیالی کا مظاہرہ ہے۔ اس لئے اس روشن خیالی کے دور میں کسی حکومت میں مذہبی نظام کی ترویج از منہ منظرہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اس لئے وہ سرے سے اس مطالبہ ہی کو دقت یا نوعیت اور مطابقت کی تنگ نظری پر سنی قرار دیتے ہیں جو ترقی کے راستے میں سنگ گراں بن کر رکھا گیا ہے۔ لیکن وہ اپنے ان خیالات کو بر ملا کہنے کی جرات نہیں کر سکتے اس لئے کہ انہیں خطرہ ہے کہ اس سے عوام میں بدنام ہو جائیں گے اور شاید ان مصائب و مدارج سے محروم، جن پر وہ آج کسی نہ کسی طرح قابض ہو چکے ہیں، کچھ لوگ ایسے ہی جنہیں صرف اتنا تصور ہی پکپی پیدا کر دینے کیلئے کافی ہے کہ اگر شرعی نظام نافذ ہو گیا تو اس میں نماز پڑھی پڑھی۔ انہیں نماز روزہ کا خطرہ چھلا دہ بن کر ڈر رہا ہے اور یہ سوچ کر ان کی روح فنا ہو جاتی ہے کہ اگر شریعت کا قانون جاری ہو گیا تو کیا کریں گے؟

کچھ وہ ہیں جو قوانین شریعہ کا احترام تو کرتے ہیں لیکن وہ مخالفت ہیں کہ مولوی صاحبان کی وہ شریعت جو ہزار برس پہلے کے ماحول اور اس زمانہ کے مقتضیات کو پورا کرنے کیلئے وضع کی گئی تھی، ہمارے زمانہ کے تقاضوں کو کس طرح پورا کرے گی! اس خطرہ سے وہ خود گو گلو میں ہیں۔

### انکاری کینم و نہ این کاری کینم

نہ نظام شریعہ کے نفاذ کے مطالبہ کی تردید کر سکتے ہیں نہ اسے نافذ کرنے کی ہمت اپنے اندر پاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اسے آج کی ضروریات کے پیش نظر ناممکن العمل پاتے ہیں۔ نہ صرف ناممکن العمل بلکہ جب وہ مولوی صاحبان سے سنتے ہیں کہ "شریعت" کی رو سے غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا تو وہ اور بھی ڈرتے ہیں کہ اس قسم کے قانون کو ہم آج کی جذب و دنیا میں کس طرح چلا سکیں گے! فرض کیا کہ ان دعویٰ کرنے والوں کو مطالبہ کرنے والوں سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا ہے۔ اور ان فریقین کے اندر اسلام بچا رہا، مشہد روجیران کھڑا ہے کہ عداوتی تو کہ عداوتیں اور کڑوں تو کیا کروں۔ کس طرح انہیں سمجھاؤں کہ مجھے نہ تم سمجھے ہو نہ تم۔



بات بالکل سیدھی سی ہے۔

اسلامی نظام کی اساس اس حقیقت کبریٰ پر ہے کہ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے۔

ایک مستقل حیثیت اختیار کر کے مختلف مذاہب (یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقے) بن چکا ہے۔ اور اس کے بعد فرقہ بندی کے تعصب کی بنا پر کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ کل ٹھہر چکے ہیں، لہذا اللہ یوم فرعون ہر فرقہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میرے ہاں کے جزئیات ہی اصل دین ہیں اور بس۔ ہم صدیوں سے اسی پیچ میں الجھے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور خدا کی وہ زندہ اور روشن کتاب، جو ہر زمانہ میں ہمارے لئے مشعل ہدایت بنی یعنی، موجود و محبوب بن کے رہ گئی ہے۔ چنانچہ آج بھی جب پاکستان کیلئے اسلامی نظام شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ہر مطالبہ کرنے والے کے پیش نظر ان ہی جزئیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی زمانہ کے مقتضیات کو پورا کرنے کیلئے وضع کی گئی تھیں اور جنہیں انہوں نے محض تقلیداً مستقل اور غیر متبدل حیثیت سے رکھی ہے وَمَا أَنْزَلْنَا مِنْ سُلْطَانٍ دَسَّ كُنْتُمْ لَنَا مِنْ كُفْرٍ سَنَدٍ نَبِيْنَ نَازِلٍ كِي

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ نہ تو اسلامی نظام شریعت کا مطالبہ کرنے والے کوئی ایسا نظام پیش کر سکتے ہیں جو سب کے لئے قابل قبول ہو یعنی جسے ہر ایک "شریعت" تسلیم کر لے، اور نہ ہی وہ خطرہ بے بنیاد ہے جو وعدہ کرنے والوں میں سے کم از کم، ایک گروہ کو ہوا بنا کر ڈرا رہا ہے کہ معلوم کہ یہ کن نامکن العمل قوانین کی تنفیذ کا مطالبہ کر دیں جسے ہم آج کی دنیا میں چلا ہی نہ سکیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا اصولی نظام بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ جس کے منصوص ہونے میں کسی کو کلام نہ ہو اور جس کی روشنی میں ایسے قوانین وضع کئے جاسکیں جو ہمارے زمانہ کے مقتضیات و عواطف کو بطریق احسن پورا کر سکیں اور جس کی طرف ساری دنیا الپھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھے۔

لیکن اس نظام کی اساس قرآنی ہوگی اور مسلمان شاید اتنی خرابیوں کے بعد بھی قرآن کے قریب آنے کے لئے تیار نہیں۔

جہاں تک ہمیں علم ہے۔ اس وقت تک مطالبہ کرنے والوں کی طرف سے، کوئی متین چیز کسی گوشہ سے بھی باہر نہیں آئی جسے یہ کہہ کر پیش کیا گیا ہو کہ یہ ہے وہ اسلامی نظام شریعت جس کی تغذیہ کا ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ اس باب میں اللقبہ، حکومت پنجاب کے محکمہ تشکیل جدید اسلامیات کے ڈائریکٹر مسٹر اسد لیڈ پولڈ، کی ایک کوشش محسوس پیکر میں ہمارے سامنے آئی ہے جسے انہوں نے اسلامی نظام کے خاکہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

اسد صاحب نے عرفات بابت مارچ ۱۹۴۷ء میں، "اسلامی آئین سازی" کے عنوان پر (انگریزی میں) ایک مبسوط مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں وہ اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کے متعلق دین نے صرف بڑے بڑے اصول متین کئے ہیں اور ان اصولوں کی جزئیات کو ہر زمانہ کے لوگوں کے تفقہ و اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے یہ جزئیات ابدی طور پر نافذ العمل نہیں ہو سکتیں۔ لہذا مختلف زمانہ کے ائمہ فقہ نے اپنے اجتہادات سے جو قوانین و ضوابط مرتب کئے تھے وہ ان ہی کے زمانہ کے لوگوں کے لئے قانون شریعت تھے۔ آنے والوں کے لئے نہیں۔ یہاں تک بات دبی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس سے آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ دین کی نصوص، جمادی طور پر غیر متبدل رہیں گی اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے واجب العمل قرار پائیں گی، کتاب و سنت کے اندر ہیں۔ سنت سے اگر ان کی مراد روایات ہیں اور ان کی یہی مراد ہے جیسا کہ وہ ذرا آگے چل کر خود ہی اس کی تصریح کر دیتے ہیں، تو حیرت ہے کہ یہ صاحب اس ضمن کو خود اپنے ہی تسلیم کردہ اصول سے کس طرح مطابق پاتے ہیں۔ اصول ان کا یہ ہے کہ (۱) دین نے صرف اصول عطا کئے ہیں جزئیات متین نہیں کیں اور (۲) اصول دین کے تابع جو جزئیات متین ہوں گی وہ ایک خاص ماحول سے متعلق ہوں گی۔ روایات نے اس قدر جزئیات متین کی ہوئی ہیں کہ وہ کسی صورت میں ائمہ فقہ کے جزئیات سے کم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل تشیع حضرات کے مذہب کی بنیاد ہی اس دعوے پر ہے کہ شریعت کے متعلق تمام جزئیات روایات میں موجود ہیں اس لئے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ ائمہ فقہ شریعت کی جزئیات اپنے اجتہاد

سے مرتب کرتے۔ اسد صاحب نے فقہاء کی مرتب کردہ جزئیات کو قابل تغیر و تبدل اور ولایت کی جزئیات کو ناقابل تغیر قرار دے کر نہ صرف اپنے مسلمہ اصول کو ہی چھوڑ دیا ہے بلکہ اہل حدیث اور اہل فقہ کی پرانی بحث کو چھیڑ کر ایک فرقہ کی طرف ذاری کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون کا بیشتر حصہ اسی میں صرف کر دیا ہے کہ ائمہ فقہ کی مرتب کردہ جزئیات آنے والوں کے لئے شریعت کا حکم نہیں رکھتیں۔



اس کے بعد انہوں نے اسلامی نظام کے کچھ خط و خال متعین کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ "دولت اسلامیہ کا امیر مسلمان ہو گا جسے ملت منتخب کرے گی اور اسے اس کا اعلان کرنا ہو گا کہ وہ قانون اسلامی کے مطابق حکومت کریں"۔ یہ بالکل درست ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا ہے کہ اس امیر کی ایک مجلس شوریٰ ہوگی جو ملت کے منتخب کردہ نمائندگان پر مشتمل ہوگی۔ یہ بھی درست ہے۔ البتہ انہوں نے جو لکھا ہے کہ اس مجلس شوریٰ کے فیصلے کثرت رائے سے طے پائیں گے۔ جنہیں امیر کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس میں مزید فکر کی گنجائش ہے۔ لیکن انہوں نے جو اس سے بھی بڑی چیز بیان کی ہے وہ آگے آئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس حکومت یا امیر مہم مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی اطاعت معروفت میں ہے مصیبت میں نہیں۔ یہ لکھنے کے بعد وہ خود ہی اس سوال کو سامنے لاتے ہیں کہ اگر افراد ملت کو یہ حق دیدیا جائے کہ وہ جس فیصلہ کو معروفت سمجھیں اس کی اطاعت کر لیا کریں اور جسے مصیبت سمجھیں اس کی اطاعت سے انکار کر دیں تو اس سے ایک ایسی نوعیت (Anarchy) کا رد و کھل جائے گا جس سے کوئی نظام حکومت قائم ہی نہیں رہ سکے گا۔ اس کا حل وہ یوں بتاتے ہیں کہ یہ حق افراد کو نہیں بلکہ ملت کو دیا جائے گا اور ملت استصواب عامہ سے فیصلہ کیا کہے گی کہ کہاں تک اطاعت ضروری ہے اور کہاں سے مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔

اسپاسی پر ایک اور اشکال لاحق ہو گیا کہ اس استصواب کا انتظام کون کرے گا۔ یاشقا



اگر امیر اور اس کی مجلس شوریٰ میں اختلاف ہو جائے تو اسے کون رفع کرے گا۔

اس شکل کا حل یہ تہلے ہیں کہ امیر اور مجلس شوریٰ کے اوپر ایک ایوان اعلیٰ <sup>Supreme Council</sup> ہوگی جس کے فیصلے ان تمام امور میں ناطق ہوں گے۔

یعنی بالفاظ دیگر، زمانہ حکومت و اقتدار و حقیقت اس ایوان اعلیٰ کے ہاتھ میں ہوگی۔ اور اس کے فیصلوں کا ہمیں مراعہ نہیں ہوگا۔ یہ ملت کے منتخب کردہ امام کو بھی اٹک کر سکے گی اور اس کی مجلس شوریٰ کے فیصلوں کو بھی بدل سکے گی۔ ملت اور حکومت کی منازعت کی صورت میں، یہ حکم کا بھی کام دے گی۔ اور اس کے فیصلے آخری ہوا کریں گے۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ مجلس اعلیٰ کن حضرات پر مشتمل ہوگی۔

علمائے کرام پر جو قرآن اور حدیث کا پورا پورا علم رکھنے ہوں گے اور

امور دنیا سے بھی واقف ہوں گے؛

ہم سمجھتے تھے کہ اسد صاحب مزب نثر اور ہیں۔ روشن دماغ ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ تاریخ اور قرآن پر نگاہ رکھنے کے مدعی ہیں۔ اس لئے وہ قرآنی اصول و مہریت و مشاورت کو صحیح طور پر سمجھ چکے ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ وہ اسلامی نظام حکومت کو، انتخاب، جمہوریت، مشاورت، وغیرہ کی دادوں سے گزارنے ہوئے، فالس برہنیت *Priest Hood* کے غامض لے گئے جہاں آج تک نہ عقل انسانی کا چارچ روشن ہوا ہے۔ زوریزدانی کی عالمتاب شاعروں نے بارپایا ہے۔

اور اس کی دلیل ابھی آیت قرآنی جس کے غلط مفہوم نے بہت سے لوگوں کو قرآنی نظام حکومت کو صحیح طور پر سمجھنے سے روک رکھا ہے۔ وہ آیت جلیلہ ہے۔

اَطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ

فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

اور اس کے معنی کئے جاتے ہیں۔

اطاعت کرو اللہ کی۔ اس کے رسول کی۔ اور اپنے میں سے صاحبان حکومت کی، پھر اگر

کسی معاملہ میں تمہارا اور ارباب حکومت کا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کے لئے، اے حباد۔

اور اس کا مفہوم

(۱) اللہ کی اطاعت — بذریعہ قرآن

(۲) رسول کی اطاعت — بذریعہ روایات

(۳) اور اگر تم میں اور حکومت میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو اس کے فیصلہ کے لئے قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کیا کرو۔

(۴) یعنی ان علماء کی طرف جو قرآن و حدیث جانتے ہوں۔

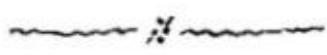
یعنی حکومت الگ ہے۔ علماء کی جماعت الگ ہے۔ ملت کو حق حاصل ہے کہ جب جی چاہے حکومت کے فیصلوں کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اس صورت میں حکومت ان سے اپنے قانون کی اطاعت کرنے کی مجاز نہیں۔ حکومت اور قوم دونوں کو علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہونا ہو گا جو قرآن اور حدیث کی رو سے امتنازع فیہ کا فیصلہ کریں گے۔ اور یہ فیصلہ حکومت اور قوم دونوں کے لئے دلچسپ لگتا ہو گا۔ دیکھا آپ نے! "قیصر اور خدا" دین اور دنیا کی وہی تفریق جسے پاپائیت نے اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے لئے وضع کیا تھا، کس طرح ہلکے تخت المشعور تک میں سرایت کر چکی ہے!

اس آیت مقدسہ کا صحیح مفہوم رکھو جو آیت اسلامی نظام حکومت کا ایک محکم ہول در انوش ہے، یہ ہے کہ افراد ملت پر مرکزی حکومت اسلامیہ (جو اللہ اور اس کے رسول کی جانشین ہے) کی اطاعت لازم ہے اور ان افسران ماعت راوی الامن ومنکم کی اطاعت بھی جو مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ہوں۔ لیکن ان افسران ماعت کے فیصلوں کے خلاف ملت کو اپیل کا حق ہو گا اور یہ اپیل مرکزی حکومت کے ہاں دائر کی جائے گی

ہم نے اس آیت میں "اللہ اور رسول" سے مرکزی حکومت اسلامیہ مراد لی ہے۔ یہ ہمارا مقصد نہیں بلکہ قرآن کی مستند آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور ہم سے پہلے، بہت سے ائمہ دین

کے متعین کردہ حدود کے اندر رہا ہے دمانہ کے مقضیات کے مطابق جزئی احکام مرتب کر گئی۔ ان جزئیات کی ترتیب میں ان تمام جزئیات سے استفادہ کیا جائے گا جو اس سے پیشتر وقتاً فوقتاً مرتب ہوتی رہی ہیں اور جو کتبِ حاریث و فقہ میں ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ ہمارا سرمایہ علم ہے جس سے تمتع لازم اور باعثِ فخر و مسابہا ہے۔ اس طرح سے مرتب کردہ جزئیات کا مجموعہ ضابطہ نظامِ اسلامی قرار پا جائے گا۔ قرآن کے ان آئی حدود کی وضاحت بھی چندان مشکل نہیں ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہماری ملت میں ایسے افراد موجود ہیں جو اس فریضہ کو بطریقِ احسن سرانجام دیکتے ہیں۔

ہم مجلسِ آئیٹن سائز کے اراکین سے (جو اب پھر کراچی میں جمع ہو رہے ہیں) گزارش کریں گے کہ وہ کام کے ان فرسودہ طریقوں کو چھوڑیں جن میں معاملات، بھنبوریں اٹھی ہوئی لکڑی کی طرح دیکھنے کی گردش کے باوجود، شام کو دمیں کے دمیں رہتے ہیں۔ وہ ان واضح خطوط پر غور کریں جن کا ادھر پہلے ذکر کیا ہے اور اس کے بعد، انتخابِ عامہ کے ذریعہ اس قسم کی مجلسِ شورٰی کی تاسیس و تعمیر کریں جو قرآنی حدود کی روشنی میں ملتِ اسلامیہ پاکستان کے لئے نظامِ حکومت کی تدوین کا کام سرانجام دے۔ یہ سب کرنے کا کام۔ اللہیں منکر رحیل و مشید!

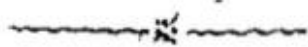


ہم نے طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۷ء میں "محاسبہ نفس" کے زیرِ عنوان حکومت کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تھی کہ نذرانِ ملت اور دشمنانِ پاکستان کا وہ طبقہ جو حکومت کے ایوانوں تک گھس آیا ہے یا خارجی اثرات سے حکومت کی مشینری کو مفلوج کرنے کی فکر میں ہے، اس کا استیصال کیا جائے ورنہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت ان کی سازشوں کی حریف نہیں ہو سکے گی۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اربابِ حل و عقد کو اس خطرہ کا احساس ہو گیا اور مختلف گوشوں سے اس سے متعلق آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ سب سے پہلے قائدِ اعظم نے اپنی ڈھاکہ کی تقریر میں سنرایا۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے

نہیں کہ عوام یا ملازمین سے یہ کہنیا جائے کہ ان کی چالوں میں نہ آنا۔ جب تک حکومت عوام کا اعتماد حاصل نہیں کرتی اور ملازمین کی جائز شکایات کا مداوا نہیں کرتی، دشمنان پاکستان کی کمزور سے کمزور سازشیں بھی کامیاب ہو جائے گی۔

اگر دشمنان ملک و ملت سرکاری ملازمین کو گمراہ کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی سازشوں کا حال کہیں زیادہ وسیع ہوگا، ہمیں خوشی ہے کہ حکومت اس قدر ہوشیار ہے کہ اسے ایسی دشمن پاکستانی جماعتوں کا علم ہے، لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے مداخلت کی کیا صورت کی؟ سرکاری ملازمین یا تو اپنے مطالبات میں مخلص ہیں اور جیسا کہ خود حکومت نے تسلیم کیا ہے۔ ان کے دل میں کھوٹ نہیں، زیادہ قصداً دشمن پاکستانی جماعتوں کے معاون یا آلہ کار بن رہے ہیں۔ اگر وہ مخلص ہیں تو انہیں ایسی دشمن جماعتوں کے ناموں اور سرگرمیوں سے مطلع کر دینا چاہیے تاکہ وہ نادانستہ طور پر ان کے حال میں نہ پھنس جائیں۔ اس کے برعکس اگر وہ قصداً اشرار میں پیدا کرتے ہیں اور دشمن پاکستانی جماعتوں کے قصداً مؤید و مددگار ہیں تو ایسے غداروں سے وہی سلوک کرنا چاہیے جو ہر غدار سے ہوتا چلا آیا ہے۔ حکومت بصورت اول ملازمین کو راز دار نہ بنا کر اور بصورت دیگر مخبر کو کثیر کردار تک نہ پہنچا کر نہایت خطرناک کھیل کھیل رہی ہے۔ پہلی صورت میں وہ اپنے وفاداروں کو دشمنان ملک کا آلہ کار بننے دیکھ رہی ہے اور دوسری صورت میں دشمنوں کی سرگرمیوں سے باخبر ہوتے ہوئے بھی گزرت اور تعزیر میں تغافل برت کر دشمنوں کو خطرناک ڈھیل دے رہی ہے۔ سرکاری ملازمین کا دشمنوں کا آلہ کار بن جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں، اگر فتنہ پردازوں کی سازشوں کا زہرا اس وفادار طبقہ تک کو بھی متاثر کر رہا ہے تو حکومت اور ملک کی خیر نہیں، حکومت کے اندرونی نظام میں ایک پرزہ بھی خراب نہیں ہونا چاہیے، ایسا یقیناً نہیں ہو سکتا بشرطیکہ حکومت فراست و تدبیر سے کام لے۔



لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ ہمارے ارباب حکومت نہ صرف یہ کہ ان فتنوں اور سازشوں کا علاج ہی

عزم و استقلال سے نہیں کرتے بلکہ وہ خود تشخیص مرغن میں بھی مستقل مزاج نہیں رہتے۔ چنانچہ یہی وزیر اعظم صاحب جنہوں نے ۱۳ اپریل کو، ان سازشی گروہوں کے فتنہ کو پاکستان کا اصلی دشمن قرار دیا تھا۔ تب ہی روز بعد فرماتے ہیں کہ

میرے نزدیک صوبائی تعصب ہی تمنا وہ خطرہ ہے جو نہ صرف مملکت پاکستان کو کمزور ہی کر دے گا بلکہ اس کی ہستی کو فنا کر دے گا۔ جو لوگ پاکستان کی دولت بیک صوبائی عصبیت کی تبلیغ کرتے ہیں وہ مملکت پاکستان کے ہلک ترین دشمن ہیں۔

(ڈان، ۱۶-۱۷)

اس میں کیا شبہ ہے کہ صوبائی تعصب، تخریب پاکستان کے لئے ایک زہر ملاہل ہے اور طلوع اسلام اس باب میں بھی پہلے دن سے ارباب حل و عقد کی توجہ اس طرف منطقت کراہے؛ لیکن یہ کہنا کہ صوبائی تعصب ہی تمنا اصلی خطرہ ہے ملت کی نگاہوں کو غداران ملت کی اندرونی سازشوں کی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف پھیر دینے کا موجب بن جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر خطرہ کو اپنی اپنی جگہ رکھا جائے اور قوم کو ہر ایک سے آگاہ کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ارباب حکومت بیانات دیتے یا تقریریں کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ مسلم لیگ کی لیڈری اور انکی امروزہ حیثیت میں بہت بڑا فرق ہے۔

~~~~~ پو ~~~~~

کیونٹوں کی سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محترم وزیر اعظم صاحب نے راولپنڈی میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔

اسلام بجائے فریض ایک مکمل معاشی نظام ہے اس لئے مسلمانوں کو، عوام کی سماجی مشکلات کے حل کے لئے کسی بیرونی معاشی نظام کی طرف نگاہ نہیں کرنی چاہیے۔ قرآن اتحاد، مساوات اور اخوت کی تعلیم دیتا ہے اور اسی تعلیم میں ہماری تمام مشکلات کا حقیقی حل پوشیدہ ہے۔

(ڈان - ۶ اپریل)

اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے اخبار ڈان نے اپنی ۷ مارچ کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا:-

یہ بالکل واضح ہے کہ وہ لوگ جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں لیکن کسی بیرونی ماسخی نظام کو قرآنی نظام سے ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں، تو ایسے لوگ مسلمان ہی نہیں۔ خواہ رسی طور پر دعویٰ ایمان بھی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ اور اپنے غیر اسلامی مقاصد کے حصول کے لئے اسلام-اسلام، کیوں نہ پکاریں۔

ان بصیرت افروز حقائق کی صداقت میں کسے کلام ہے۔ لیکن فریق مقابل جب پوچھتا ہے کہ قرآنی نظام ماسخ، جسے آپ تمام نظاہمائے عالم سے ارفع و اعلیٰ بتا رہے ہیں، ہمیں کہہ دیجئے تو فرمائیے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ اس کا اعتراض یہ ہے کہ اگر فی الواقعہ تمہارا پاس کوئی ایسا نظام موجود ہے تو اسے ناقذ کیوں نہیں کیا جاتا؟ آپ جب مساوات اسلامی کا ذکر فرماتے ہیں تو وہ عوام سے کہتے ہیں کہ ذرا اپنے وزیر اعظم صاحب سے پوچھئے کہ کیا وہ مساوات یہی ہے کہ جو آپ بین الاقوامہ میں ہے کہ جہاں کوئی چیز بھی مساوی نہیں! کہئے کہ عوام آپ کی مانیں گے یا فریق مقابل کی! سوچئے کہ اشرا کی بات کا ہو گا یا آپ کے بصیرت افروز حقائق کا! آپ انہیں الزام دیتے ہیں کہ یہ مذہب کے نام کو اپنے مقاصد کے برے کار لانے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ یہ شروع سے کہتے آ رہے ہیں کہ "مذہب اکیلیفون ہے" جو ان سرمایہ داروں اور رجحان پرستوں نے اس لئے وضع کر رکھی ہے کہ جب عوام اپنی حسد حالی سے تنگ آکر انقلاب کے لئے اٹھیں تو انہیں اس افیون سے پھر سے سلا دیا جائے۔ وہ عوام سے یہ کہتے ہیں کہ تمہارے لیڈر ملے پاس نہ کوئی ماسخی نظام ہے، اور نہ یہ کسی ایسے نظام کو ناقذ کرنا چاہتے ہیں جس میں ان کا تفوق چھن جائے۔ یہ تمہیں قرآن، فدا، اسلام کے نام سے دھوکا دیتے ہیں۔ اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو اس کا عملی ثبوت کیوں نہیں پیش کرتے! کہئے کہ عوام کے جی تو یہ باتیں لگیں گی یا آپ کے مواعظِ حسنہ!

ہم اپنے ان اسباب بست و کشاد سے ایک مرتبہ پھر گزارش کریں گے کہ اگر جیسا کہ وہ خود بتا رہے ہیں، ان لوگوں کی طرف سے خطرہ، ایک دائمی خطرہ ہے اور ایسا خطرہ کہ جو مملکت پاکستان کے لئے سخت نقصان کا باعث ہو سکتا ہے تو اس خطرہ کا ازالہ اس قسم کے رغط سے نہیں ہو سکے گا۔ عوام کی مشکلات عملی میں۔ ان کا حل بھی عملی طور پر ہی ہو سکے گا۔ بھوک کا علاج روٹی کے سوا کچھ نہیں، عوام آپ کی ان مذہب کے نام پر ایلوں سے زیادہ متاثر نہیں ہو رہے۔ اور یہ عین فطری چیز ہے۔ وہ اپنے مصائب کا حل جانتے ہیں اگر آپ اس کا حل پیش نہیں کر سکیں گے تو جو شخص بھی انہیں ان کا حل بتائے گا وہ اس کی طرف چلے جائیں گے اس لئے ہم باادب گزارش کریں گے کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے

پیش کر غافل، اگر کوئی عمل دستہ میں ہے۔

جس قرآنی نظام معاش اور اسلامی سادات کا آپ ذکر فرماتے ہیں اسے قوم کے سامنے لائیے اور عملاً نافذ کیجئے۔ یہی ان خطرات کا حل ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔



ہم نے مارچ کی اشاعت میں، "محاسبہ نفس" کے زیر عنوان یہ بھی لکھا تھا کہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ تقسیم ہند کے وقت ہم سے بعض کوتاہیاں ہوئیں اور اس کے بعد ہم جن مصیبتوں کا شکار ہوئے ان کی زیادہ وجہ خود ہماری اپنی خامیاں اور مال نا اندیشیاں تھیں۔ اس اعتراف حقیقت سے فائدہ یہ ہو گا کہ ہم آئندہ کے لئے محتاط ہو جائیں گے اور اپنی کمزوریوں اور خامکاریوں کو رقع کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ہمارے اس باب حل و عقد غالباً اس دور سے کہ اس اعتراف سے کہیں وہ تصور روار نہ ٹھہرا دیئے جائیں تو ہم کو یہ جھوٹا اطمینان دلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ان کی یہ تمام قربانیاں حصول آزادی کی خاطر تھیں جو ہر قوم کو دینی پڑتی ہیں۔ اس لئے انہیں ان قربانیوں پر خوش ہونا اور فخر کرنا چاہیے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ہمارے محترم وزیر اعظم صاحب نے ایک اجتماع میں فرمایا۔

مسلمانان ہندوستان نے پاکستان بھری قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔ تاریخ اس قسم کی

گراں قدر قربانیوں کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ کسی قوم کو حصول آزادی کے لئے ایسی قربانیاں نہیں دینی پڑیں جیسی کہ حصول پاکستان کے لئے دینی پڑی ہیں۔ بے شمار مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ امارے گئے۔ لاتعداد خانماں برباد کر دیئے گئے اور ان کا سب کچھ لے گیا

انہیں اس حالت میں پاکستان آنا پڑا۔  
 رڈان ۱۶

وہ کوئی آنکھ ہے جو مسلمانوں کی اس عظیم الشان تیاری پر فخر و ناز نہ نشاں نہیں، اور طلوع اسلام کی دیدہ بینا قوم تو کسی وقت بھی اپنے آنسو تھام نہیں سکی۔ لیکن ان تباہیوں اور بربادیوں کو "حصول آزادی کے لئے قربانیاں" قرار دیدینا خود منسربری ہے۔ اور طلوع اسلام اس لئے اس کی طرہت بار بار توجہ دلاتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ قوم اتنی جبری غلط نہیں میں مبتلا رہے جس سے وہ ضعیفی و کمزوری کے مرگ مغالبات اور طاعونی قوتوں کے خلاف نبرد آزمائی میں جام شہادت میں غرق کرنا بھول جائے۔ یادہ تر کار کو ہجرت اور متاع بردہ کو اتفاق فی سبیل اللہ سمجھنے لگ جائے۔ اول تو یہ دیکھئے کہ یہ "قربانیاں" حصول پاکستان کے بعد دینی پڑی ہیں۔ حصول پاکستان تک تو ملت کا ایک بال بھی نیٹکا نہیں ہوا تھا۔ تاہم عظیم کی سلامت روی کی سیاست نے، تمام غصہ و جھجھند میں ایک رضا کار کو حیل تک نہیں جانے دیا تھا۔ اس لئے "قربانیاں" حصول پاکستان کے لئے نہیں تھیں پاکستان ہیں بغیر قربانیوں کے مل گیا تھا۔ اگر پاکستان قربانیوں سے مشروط ہوتا تو اس کے لئے سہ ہیشا پید اہی دو تین نسلوں تک اور انتظار کرنا پڑتا۔

پھر جس انداز سے مسلمان تباہ ہوا ہے اسے قربانی سے تعبیر کرنا، اس جوہر بے بہا کی ہتک ہے۔ قربانی میں انسان، اپنے نسب العین کی مدافعت میں، پورے عزم و یقین کے ساتھ، خطرات کے مقابلے کے لئے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اگر خطرات کا سیلاب بے پناہ ہو تو ہنستا ہوا، مردانہ دار جان دیدیتا ہے۔ لیکن اپنی آن پراپنچ نہیں آنے دیتا۔ مسلمان بچا راز با مذہ کر مارا گیا۔ وہ تو بے خبری میں ہلاک ہو گیا۔ اسے کس سپر کی عالم میں چھوڑ دیا گیا اور وہ موت سے بھاگتا ہوا موت کے منہ میں چلا گیا۔ لہذا اس قسم کی موت کو شہادت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ آتش نشاں کے لاوے میں بھسبھس ہونے والے گلزار ابراہیمی کے شاخہ نہیں کہے جاسکتے۔ قصاب کے بکرے کے خون اور مرد جانناز کے لہو میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کوئی حقیقت میں۔ دست



ترسنگ آئندہ "کو تپان دفا" نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! مسلمان قربانیوں کے جوہر دکھا سکتا تھا اگر اس کے اکابر اسے تنہا چھوڑ کر نہ بھاگ آتے۔ اس وقت اس کی قربانیاں دیکھتے اور پھر ان قربانیوں کا وہ زندہ نتیجہ کہ جس سے دہلی کے لال تلہ پر آج ہلالی پرچم لہرانا نظر آتا۔ جو قوم شہید گنج کی بوسیدہ اینٹوں کی خاطر جانیں دے سکتی ہے وہ اپنے عزت و ناموس تک کو درندوں کے جھوں میں چھوڑ کر کبھی بھاگ نہ کھڑی ہوتی۔ اس کے باوجود ایسے چمکنے والے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں کہ بعض جسور و فیور مسلمانوں نے پستے ہوئے حائین میں لیکن اپنی آبرو کو پامال ہوتے نہ دیکھا۔ لیکن یہ سب کچھ انفرادی تھا۔ اجتماعی طور پر یہی اعتراضات کرنا ہو گا کہ یہ تباہیاں حصول آزادی کیلئے قربانیاں نہ تھیں، ہماری خامیوں کے غیر متبادل نتائج تھے۔ اسی اعتراض میں ہمارے آئندہ استحکام کا راز ہے۔



ہندوستان کے مسلمانوں کا جداگانہ ملی شخص مٹانے کیلئے، حکومت ہند نے اپنی ترکش کا آخری تیر بھی استعمال کر لیا اور ایک ریزولوشن کے ذریعے، جداگانہ جماعتوں کو خلافت قاذون قرار دینا (بجز ان کے جو صرف مذہبی، ثقافتی، معاشرتی اور تعلیمی امور سے متعلق ہوں۔ اور مذہب کے متعلق، ہندوؤں کا جو خیال ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے) ہندوستان کی پارلیمنٹ میں اس ریزولوشن پر بحث کرتے ہوئے جو تقاریر کی گئیں وہ اس ذہنیت کی صاف صاف غمازی کر رہی ہیں جس کی بنا پر اس ریزولوشن کو پاس کیا گیا ہے۔ مثلاً مسٹر آنگر نے اس ریزولوشن کو پیش کرتے ہوئے پہلے فرقہ وارانہ تحریکوں کے نقصانات کا ذکر کیا اور سب سے بڑا نقصان خود تقسیم ہند کو بتایا، اور اس کے بعد کہا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس تاریخی منظر کے بعد، کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم اپنی پامال راہوں پر چلتے جائیں۔ یا فروری ہے کہ اب ہم ایسی نئی راہیں تلاش کریں جن سے اس شدت ذ انتشار میں وحدت پیدا ہو جائے، اس مقصد کے لئے وحدت پیدا کرنے کا کوئی ایسا ذریعہ تلاش کرنا ہو گا جو مذہب سے زیادہ پاؤدار ہو۔ نظری طور پر نصب العین کے لئے، انسانیت مذہب، اور خدمت خلق۔ عبادت بالکل درست ہے۔ لیکن اس نصب العین تک پہنچنا

کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ہم دنیاوی خطوط پر ایک قوم تشکیل کریں۔ یہی ہمارا مقصد ہے۔ ہر ہندوستانی کو اول و آخر ہندوستانی ہونا چاہیے۔ اور بس۔ ہمارے راستے میں مشکلات ضرور حاصل ہوں گی۔ لیکن جب دوسری اقوام، مثل امریکہ اور روس نے، مختلف مذاہب اور نسلوں کے لوگوں کو ایک قوم میں تبدیل کر دیا ہے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہندوستان اس باب میں کامیاب کیوں نہ ہو۔؟

ڈاکٹر مشیاما پرشاد مکر جی نے کہا۔

مجھے اعتراض ہے کہ اقلیتوں کو مزور خدمت ہو گا کہ اگر ہم نے اپنے مخصوص جہاگاہ حقوق کو چھوڑ دیا تو اکثریت ہمیں کھیل کر رکھ دے گی۔ لیکن، جیسا کہ وزیر اعظم نے فرمایا ہے۔ اب انگریزوں سے چلا گیا۔ اب ہر اقلیت کو اپنی حفاظت کے لئے، اکثریت ہی کی پناہ دھونڈنی پڑے گی

ہندوستان ٹائمز ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء

یہ اقتباسات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ یہ ہندوؤں کی طرف سے تھا۔ اس کے بعد مسٹر محمد حسین صاحب نے فرمایا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے مخلوط شاہدوں کو رائج کرنا چاہیے۔ جس طرح اکبر نے کیا تھا۔ لیکن اکبر تو ہم غالب سے متعلق تھا۔ اب مسلمانوں کی لڑکیاں ہندوؤں کے حماں جائیں گی بشرطیکہ ہندوؤں نے اسے پسند فرمایا

پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ وہاں کے مسلمانوں سے، ذفا شعاری کے ثبوت میں کیا کیا تقاضے کئے جا رہے ہیں۔ اچاریہ کر پلائی، سابق صدر کانگریس، نے پچھلے دنوں نئی دہلی میں ایک تقریر کے دوران میں کہا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ جو درجہ حیدرآباد جائیں اور اس ریاست میں اپنے ہم مذہب مسلمانوں کی دہشت انگیز کارروائیوں کا خاتمہ کریں۔ وگرنہ ان کا دعویٰ ذفا شعاری بالکل بے معنی سمجھا جائے گا۔ ہندوستان کے مسلمان حکومت ہند و فادرسی اور اطاعت شعاری کے اعلانات کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم ان کے ان اعلانات

پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں جبکہ حالت یہ ہے کہ ان کے بھائی جیاں بھی دستِ نایاب

رکھتے ہیں ہندوؤں پر ظلم توڑنے سے باز نہیں رہتے۔ (ڈان پیج ۱۵)

آپ نے غور فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے دلیل و فاداری کے لئے کیا مطالبات کئے جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں جیسی تنگ نظر اور ذنی الطبع قوم دنیا میں شاید ہی کہیں ہو۔ اسی قوم کی حکومت جہنم کا عذاب ہے۔ حافظ نے کہا تھا کہ

بندۂ طلعت آں باش، کہ آنے دارد

حکومت ایسے ہی کچھ کم لعنت نہیں لیکن اسی قوم کی حکومت جس میں آن نہ ہو، بدترین عذاب ہے۔ پھر ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے خلاف یہ کچھ کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف مملکتِ پاکستان کے ساتھ تراضی مابین سے اس قسم کے عہد نامے بھی ہو رہے ہیں جن کی ذمہ داریوں کے حلقہ حقوق اور مفاد کے تحفظ کی ذمہ داریاں لی جاتی ہیں۔ (ڈان پیج ۲۰) اسی قوم کن کن طریقوں سے ستاتی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں ان کے ساتھ واسطہ پڑ رہا ہو۔ ہم جیسا کہ روز اول سے کہتے چلے آ رہے ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ پاکستان کے مسلمانوں کا اولین فریضہ اور اہم ذمہ داری ہے۔ اس وقت پاکستان کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کے پیش نظر اس اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دینا مشکل ہے۔ لیکن زور یا دبیر اس مسئلہ کا حل سوچنا ہی پڑے گا۔ اور مجھے خیال میں اس کا حل سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ کوشش کی جائے کہ ہمارے جس قدر علاقے غیر آباد پڑے ہیں وہ آبادی کے قابل ہو جائیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ لوگ بسائے جاسکیں۔ یہ مسئلہ کچھ ایسا زیادہ مشکل نہیں۔ اس کے لئے صرف عزم و ثبات کی ضرورت ہے۔ اگر ہم تہیہ کر لیں کہ ہم نے یہ کام کرنا ہے تو زندگی کو اس بیچ پر ڈھالنا جاسکتا ہے جس سے اتنی کفایت ہو سکے کہ ہم ان غیر آباد زمینوں کو مختلف اسکیموں کو بردے گا لاکر، قابل آبادی بنا دیں۔ در کیوں جائیے یہاں سندھ اور بلوچستان میں اتنے وسیع علاقے غیر آباد پڑے ہیں کہ اگر انہی کو آبادی کے قابل بنا دیا جائے تو ہماری اس بہت بڑی مشکل کا بہت بڑا حصہ حل ہو جاتا ہے لیکن

ہو قوم کو سمجھنا ہے کہ ہم ایک اہم آزمائش و امتلا کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اس قسم کے دور آزمائش سے جس میں یورپ کی فو میں پچھ برس تک (دوران جنگ میں) اور اس کے بعد آج تک، مستحکم چلی آ رہی ہیں۔ اگر ہم اپنے اور آپ اس قسم کی پابندیاں عائد کر لیں تو یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن ان چیزوں کے لئے پختگی کر دار کی ضرورت ہوتی ہے اور وہی ہم میں مفقود ہے۔



کراچی میں یوم اقبال کے پروگرام کے متعلق ایک بسیط مصنون الگ شائع ہو رہا ہے۔ ان کا پیوں کے پریس میں جانے کے وقت تک اس دل چسپ "تقریب کی ہنوز ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ بارے ان کا پیوں کی تکمیل کے وقت بعض احباب کی زبانی سرتع رنگ و چنگ کی بعض جھلکیاں ہمارے لئے فردوس گوش نہیں جنہیں قارئین طلوع اسلام تک نہ پہنچا نا سخی معلوم ہوتا ہے۔ انیسویں ہے کہ تلت گنجائش کی وجہ سے ہم اس محفل نغمہ و نعت کا محض اجالی سا تعارف ہی کر سکتے ہیں۔ پہلے دن "حتم قرآن برائے العیال ثواب" کی محفل تھی جس میں سنا ہے کہ چند "وقیانو کا خیالات کے لوگوں کے علاوہ کسی نے زحمت شرکت گوارا نہ کی۔ ویسے بھی یہ محفل اسی قبیل سے تھی جیسے مجلس رقص و موسیقی کے دعوتی رتوں پر تبرکاً ۷۷، لکھ دیا جاتا ہے۔ دوسرے دن "یوم مقالات" تھا جس میں حاضرین نسبتاً زیادہ تھی۔

تیسرے دن مجلس توالی تھی جس میں شریک ہو کر سعادت دارین حاصل کرنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اقبال کی سنہی اڑانے کیلئے توالی ہی کچھ کم سامان ماسم نہ تھی کہ وہاں رجبی ہی کسر نکانے کے لئے فطی مسخرہ اندمین چپاری، کے بھانڈپن کی ایک نقل بھی درجہ تدفین غیرت ملی اور سنا ہے کہ اس محفل میں، حکومت پاکستان کے بڑے بڑے عمائدین عظام بھی شرکت فرماتے۔

لے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ یہ چیز کچھ سے خوشی قرآن کی میزان میں کیا وزن رکھتی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ قرآن کے نام سے لگاؤ کتنوں کو ہے۔

اور چوتھے دن مشاعرہ۔ اس کی سہا سہی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ادھر، جوانی کی خاطر جوانی لٹانے والوں کی صفوں کی صفیں، ادھر دشمنان ایمان و آگہی اور سزنان تمکین و ہوش کے پرے کے پرے۔ اور اس پر رنگ افزائی محفل یوں کہ

سے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب

لے شوق ہاں اجازت تسلیم و ہوش ہے

یوں گوگل کے پاسیوں اور کھنیا کی گرہیوں نے مل کر، آزاد پاکستان میں حکیم الامت، ترجمان القرآن، بانی تصور پاکستان کی پہلی برسی منائی۔

آسماں ماحق بود گر خون مبارد بر زمیں

—:—

سندھ اور پنجاب میں وزارت کے باہمی اختلافات و تنازعات کے متعلق ہمارے کرلہنے کی صد اوردناک کسی دوسری جگہ و جہ سے فراموشی ہوگی۔ یہ آخری کا پنی پرس میں جاری تھی کہ اطلاع ملی کہ سندھ کے وزیر عظیم مسٹر کھورو کو بظرف کر دیا گیا ہے۔

جب کسی نظام میں فساد (Corruption) اس قدر عام ہو جائے جیسے تشکیل پاکستان کے بددینا ہوا ہے تو اس کا علاج پنچہ آہنی کی گرفت کے بغیر نامکن ہو جاتا ہے توٹی ہوئی ڈی کو لکڑیوں سے جکڑ کر بازتے میں تاکہ وہ پھر سے جڑ جائے۔ اس طریق علاج کو جباریت کہتے ہیں۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ امیر پاکستان، محترم قائد اعظم نے اس طریق علاج کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ہر چند اس کی بہت پہلے ضرورت تھی لیکن فیروز اس کی ابتدا تو ہوگئی۔ اب امید ہے کہ یا تو دوسرے مقامات پر اسی سے عبرت پڑی گئی یا پھر ان کی بھی باری اس طرح آگئی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صوبوں سے زیادہ خود مرکز میں اس عمل جراحی کی ضرورت اشد ہے۔ مرکز قلب مملکت ہوا کرتا ہے اور اس کے فساد سے سارا نظام جسمانی متاثر ہو جاتا ہے۔ لہذا اعضاء و جوارح سے کہیں زیادہ قلب کی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔

سابقہ اشاعت میں، جناب پرویز کا بصیرت افروز مقالہ "دراشت ارض کا ابدی قانون" شائع ہو چکا ہے۔ اشاعت پیش نظر میں، تسلیم کے نام خط "میں اسی مقالہ سے متعلق، بعض نکات کی وضاحت کی گئی ہے یہ مقالہ اس قدر مقبول ہوا کہ اب ہمارے پاس اپریل کی اشاعت کا کوئی پرچہ بھی نہیں رہا اور مانگ پرستور جاری ہے۔ طلوع اسلام کے دواول میں اس قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا گیا تھا کہ اہم مضامین کو الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا جاتا تھا جو ہزار ہا کی تعداد میں ملک کے طول و عرض میں پھیل جاتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی ابتدا پر دیر جتنا کے مذکورہ صدر مضمون سے کی جا رہی ہے۔ پمفلٹ عنقریب چھپ کر تیار ہو جائے گا۔

—:—

اشاعت زیر نظر میں، مسلم لیگ کی تنظیم کے متعلق ایک اہم مضمون شائع ہو رہا ہے جو اباب نکرہ نظر کی گہری توجہ کا محتاج ہے۔ ہم نے اس میں یہ بتایا ہے کہ ہمارے نزدیک، پاکستان میں، کسی پارٹی کی ضرورت نہیں، اس لئے مسلم لیگ کی بھی ضرورت نہیں۔ مسلم لیگ کا نصب العین ہے پاکستان کا استحکام بدیں مقصد کہ یہاں شرعی نظام قائم کیا جائے۔

اگر کوئی پاکستانی، پاکستان کا استحکام نہیں چاہتا تو وہ حکومت کا غدار ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان، شرعی نظام کا نفاذ نہیں چاہتا تو وہ مسلمان ہی نہیں۔ لہذا مذکورہ صدر نصب العین، پاکستان کے ہر مسلمان کا نصب العین ہے۔ اس لئے اس نصب العین کے لئے کسی پارٹی کی کیا ضرورت ہے۔ پارٹی کی ضرورت انہیں ہونی چاہیے جس کا نصب العین اس سے الگ کچھ اور ہو۔ باقی رہا یہ کہ انتظامی سہولیت اور ملت کے افراد کو ایک اجتماعی رشتہ میں منسلک کرنے کیلئے ایک (organization) کی ضرورت ہوگی سو اس کے لئے پارٹی بنانے بغیر بھی نہایت عمدہ عملی پروگرام بنایا جاسکتا ہے۔ جس کا خاکہ، اسی مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم اباب نظر سے درخواست کریں گے وہ ہماری مروضات کو توجہ سے ملاحظہ فرمانے کے بعد اس باب میں، ہمیں اپنے خیالات و آراء سے مستفیض فرمائیں جس کے لئے ہم شکر گزار ہوں گے۔

—:—

یوم اقبال کی تقریب پر ہمارے محترم جناب پرویز صاحب نے، بکمال گرم گسری سہیں ایک مقالہ، بعنوان "اقبال پیام نوجوانان ملت کے نام" عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے بہیم قلب شکر گزار ہیں۔ اس مقالہ کو ہم اپنی اڑ دقت میں، رہیں تک بیجا نیکی کوشش کریں گے۔

# قرآنی تعلیم

(علامہ حافظ محمد اسلم جیرا چوری مدظلہ العالی)

پاکستان قائم ہوتے ہی مسلمانوں کی مذہبی جماعتوں کی طرف سے "اسلامی حکومت" اور "قانون شریعت" کے مطالبات شروع ہو گئے۔ اب تک جو مطالبے پیش کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کا صحیح خاکہ اس کا نظام اور اس کا طریق عمل ان حضرات کے دماغوں میں بالکل نہیں ہے۔

ان علما و مذہبی پیشواؤں سے میری گزارش یہ ہے کہ وہ کسی مطالبہ سے پہلے قرآن کریم و اسلامی نظام حکومت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں۔ ان کے اوپر واضح ہو جائے گا کہ خلافت راشدہ کے بعد سے اسلامی حکومت میں جو استبداد آ گیا تھا اور جو رفتہ رفتہ ملت کی تباہی کا باعث ہوا یہاں تک کہ اس کا تقریباً ۱/۳ حصہ مشرق سے مغرب تک کفر سے مغلوب اور کفار کا محکوم ہو گیا اس کی تاثر زدہ داری مسلمانوں کی دو ہی جماعتوں پر ہے، یعنی علماء پر اور ملوک پر۔

یہ مستبد سلاطین اپنی شخصی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں سمجھتے رہے۔ چند مذہبی فرائض نماز، روزہ، حج وغیرہ کا ادا کر لینا یہی ان کے نزدیک اسلام تھا اور مہات اصول اجتماعی جو قرآن نے تلقین کئے ہیں ہمیشہ ان کی نظروں سے اوجھل رہے۔ علماء بالعموم انھیں کے تابع اور انھیں کے حامی رہے اور یہ کبھی ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان سلاطین کی شخصی اور استبدادی حکومتوں کو مثلاً قرآن کی رو سے ہمارا اولین فرض ہے۔ ان میں سے جو زیادہ اہل تقویٰ و دیانت تھے انھوں نے بھی بجز اس کے کچھ نہ کیا کہ اپنی کتاب زندگی میں ایک باب "در حد ذکر کردن از خدمت بادشاہان" کا اضافہ کر لیا۔

الغرض جب سے مسلمانوں میں بادشاہت آئی یہ اسلامی سیاست کے نادان دوست رہے جس کا

نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی جبکہ دنیا میں ہر قوم کی حکومت جمہوری ہو رہی ہے، مسلمانوں میں افغانستان اور ایران سے لیکر مصر تک شخصی حکومتیں قائم ہیں۔ بلکہ عرب میں جہاں سے جمہوریت اور مساوات کا چشمہ ایلما تھا آج پوری دس مطلق العنان استبدادی حکومتیں قائم ہیں۔ اور حیرت ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک یہ سب اسلامی حکومتیں ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ پاکستانی حکومت اسلامی خلافت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے اور نہ شاید اس کا یہ دعویٰ کرے۔ کیونکہ خلافت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی ہے۔ جس کے زیر حکومت پوری ملت کو ہونا چاہئے اور پاکستانی حکومت صرف ایک مخصوص منطقہ میں ملت کی جزی حکومت ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ استبدادی اور شخصی نہیں بلکہ جمہوری ہے جس کے باعث خلافت اور حکومت الہی سے قریب تر ہے۔

اس وقت جن جن خطوں پر مسلمانوں کی جزی حکومتیں ہیں ان کی دونو عینتیں ہیں۔ یعنی استبدادی اور جمہوری۔ اگر پوری ملت نے جیسا کہ اس کا فریضہ ہے خلافت قائم کی تو جمہوری مسلم حکومتیں سکی حمایت بھی کر سکی اور اس میں شریک بھی ہوں گی۔ لیکن استبدادی تہوں کا توڑنا آسان نہ ہو گا۔ وہ اپنی پوری طاقتیں اپنے شخص کو برقرار رکھنے میں صرف کریں گے اور اس وقت ملت کو معلوم ہو جائے گا کہ جن کو ہم مسلمان حکومتیں سمجھے بیٹھے تھے وہ کس قدر نامسلم تھیں۔

قرآن کی مدد سے جملہ مسلمانان عالم پر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ خلافت قائم کریں۔ اور اس کو انصاف اصول پر قائم کریں جو قرآن میں بیان کئے گئے ہیں، یہ اصول میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں جو عرصہ صبر ہوا طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے قرآنی دلائل کے ساتھ واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں اور پھر اس سے بھی زیادہ مدلل اور مفصل طریقہ سے اپنی کتاب تاریخ الامت کے حصہ ہشتم میں ان کو لکھ دیا ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ اصول یہ ہیں۔ قرآن حکومت کو سرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔

رَبِّنَا الْحَكْمَةُ لَدَيْهِ. اَمْرًا لَا تَعْبَهُ وَالْاِلٰهَاتُ بَا. ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنْ اَكْثَرُ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۰

کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کے محکوم نہ بنو۔ یہی

سیدھا دین ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔



آج کل جمہوریت اور آمریت دو قسم کی حکومتیں دنیا میں زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن قرآن مروجہ اصطلاحی معنوں میں نہ جمہوریت کو صحیح قرار دیتا ہے نہ آمریت کو۔ کیونکہ جمہوریت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق حکومت جمہور کو حاصل ہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں۔ اس حق سے وہ نمائندے حکومت اور وضع قوانین کے مجاز ہو جاتے ہیں۔ اور آمریت میں مختار ناطق کی ذات میں حکومت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اسلام کسی انسان یا انسانی جماعت میں حکومت کا حق نہیں مانتا۔ بلکہ اس کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔ وہی بلا شرکت غیرے حاکم اور مطلع ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۝۱۹

اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو سا بھی نہیں بناتا۔

انبیاء کریم تک کو بھی جو نبی نوع انسان کا سب سے بلند طبقہ ہے اس نے یہ حق نہیں دیا کہ وہ کسی کو اپنا محکوم بنائیں۔ بلکہ صرف یہ کہ لوگوں کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق چلائیں۔

كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالنَّبُوَّةَ لَقَدْ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُذُّوا عِبَادًا إِلَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُوِّنُوا أَنْ تَابِعْتُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ وَمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ —

کسی شخص کو جسے اللہ کتاب اور حکم اور نبوت دے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بنو بلکہ یہ کہ تم اللہ والے بنو۔ اس کے مطابق جو تم کتاب کو پڑھتے پڑھاتے ہو۔

اس لئے ملت اسلامیہ کی مرکزی جماعت خود حکمراں نہیں ہے بلکہ صرف قوانین الہی کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔ وہ ہنگامی ضروریات کے لئے جو ضوابط تیار کرے گی ان میں کوئی قانون ایسا نہیں بنا سکتی جو قرآن کے خلاف ہو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝۲۰

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے اصول کے مطابق حکومت نہ کرے وہ فاسق ہے۔

الغرض حکومت صرف اللہ کی ہے۔ اس نے اپنے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایات اور ان کی عقلوں کو صحیح راہ پر لگانے اور اپنی رضامندی اور ناراضماندی کو واضح کرنے کے لئے ایک ناقابل تغیر و تبدل کتاب قرآن عظیم کو اتار دیا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرے کہ وہ اس کی خاص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دنیا جہان کی اعلیٰ سے بے نیاز ہو جائیں۔

أَفَعَيِّرْنَا مَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ عِلْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۖ

یہاں اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم بناؤں حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری ہے۔ یہی مبارک کتاب ملتِ اسلامیہ کے لئے انفرادی اور اجتماعی دستور العمل ہے۔ جس طرح حکومت کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، اسی طرح اس کے سولے کسی کی اطاعت بھی نہیں ہے۔ امتِ اسلامیہ کا انفرادی اور اجتماعی مقصود حیاتِ صرف اللہ کی رضامندی ہے جو اسی کی اطاعت سے مل سکتی ہے۔ لیکن اللہ خود اطاعت لینے کے لڑ نہیں آتا بلکہ رسولوں کو بھیج کر ان کے ذریعہ سے اپنی اطاعت لیتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ حکمِ الہی اس کی اطاعت کی جائے۔

پھر یہ بھی تصریح کر دی کہ یہ رسول کی اطاعت، عین اطاعتِ الہی ہے۔ کیونکہ وہ حکمِ الہی ہے۔

وَمَن يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۗ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

جن لوگوں نے دنیا میں اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کر کی تھی وہ جب قیامت میں نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو جہنم میں جلتے ہوئے کہیں گے۔

رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَةً وَكِبْرَاءَنَا فَأَصَلُّوْنَا السَّبِيلَ ۗ رَبَّنَا اجْعَلْهُم مِّنَ الْعَذَابِ

وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۗ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ممتاز منصب تھے۔

پہلا منصب پیغمبری۔ یعنی لوگوں کے پاس پیغامِ الہی کو بیکم وکاست پہنچا دینا۔ اس کے امتیازات یہ ہیں۔

(۱) اس منصب کی روست آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ اور یہ امت ہمیشہ کے لئے آپ ہی کی امت ہوئی۔

(۲) پیغمبری آپ کی ذات پر ختم کر دی گئی اور آپ اس کی تکمیل کے لئے بھیجے ہی گئے تھے۔

(۳) اس حیثیت سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضہ تبلیغ اللہ کی طرف سے لازم کر دیا گیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ - ۳۷

اے رسول! جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو پہنچا دے۔ اور اگر تو نے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

دوسرا منصب امامت - یعنی احکام الہی کے مطابق لوگوں کو چلانا، ان کے باہمی تنازعات اور قضایا کے فیصلے کرنا۔ اجتماعی امور مثلاً جنگ و صلح وغیرہ میں ان کی قیادت اور رہنمائی وغیرہ۔ اس کے امتیازات یہ ہیں۔

(۱) امامت کبریٰ جو آپ نے بحکم الہی بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح و فلاح کے لئے قائم کی، آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک مستمر ہے، جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے قائم رہنی چاہئے۔

(۲) آپ کے بعد آپ کے خلفاء یعنی جانشینوں کے وہی اختیارات ہوں گے جو اس لحاظ سے آپ کے تھے، اور ان کی اطاعت بعینہ اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی۔

(۳) اس حیثیت سے آپ لوگوں سے مشورہ لینے کے لئے مامور تھے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ - ۱۵۹

اور ان سے امر (حکومت) میں مشورہ لیا کرو۔

جیسا کہ مذکور ہوا قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ منصب امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے جملہ خلفاء داخل ہیں۔ ان خلفاء کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مرکز امامت یعنی ولیفہ یا امام کے لئے یہی لفظ یعنی "اللہ و رسول" استعمال کیا ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے جن کا فریضہ یہ ہے کہ منصب امامت کو قائم رکھیں اور امت کو قرآن کے مطابق چلائیں۔ اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ۗ

اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو حکام ہوں ان کی اطاعت کرو اگر تم کسی بات میں جھگڑو جھگڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اہل مطاع اللہ ہے۔ اس کی اطاعت ہوگی رسول (مرکز) یا اس کے مقرر کئے ہوئے اور اختیار دیئے ہوئے حکام کے ذریعہ سے۔ ان حکام کا کوئی حکم یا فیصلہ اگر جھگڑو کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو ان کو حکام کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے۔ اس قسم کے نزاعی امور میں مرکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو ان کا فیصلہ کر دے گا۔ مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے۔ کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مراعہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِدُونِهِ مِثْلُ شَيْءٍ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

وَمَا كَانَ لِدُونِهِ مِثْلُ شَيْءٍ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

کسی مومن مرد یا عورت کو اپنے معاملہ میں اختیار نہیں رہ جاتا جبکہ مرکز اس کا فیصلہ کر دے اور جو کوئی مرکز کی نافرمانی کرے گا وہ مگر اہی میں پڑ جائے گا۔

یعنی مرکز دینی اور دنیاوی امور میں آخری اور بالاترین اختیار ہے جس کی اطاعت کے سوا چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی مگر اہی ہے۔

مسلمانوں میں جب سے لامرکزیت آئی اس وقت سے انہوں نے اللہ و رسول کی اطاعت کئے قرآن و حدیث کو لے لیا اور اولوالامر کی جگہ علماء آگئے۔ جن کے باہی جھگڑوں میں سے کوئی ایک جھگڑا ہی آج تک قرآن و حدیث سے فیصلہ نہ ہو سکا۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جو ضروریات زمانہ کے مطابق امت کو قرآن کی روشنی میں اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔ اور اس کی ہر قسم کی باہی نزاعیں کا فیصلہ کرتا رہے۔ نہ حدیث رسول ہے نہ علماء اولوالامر ہیں۔ قرآن نے اجارہ و بیان پرستی اور برہمنیت و پاپائیت کو فنا کر دیا ہے۔ اور سوائے اللہ کے کسی کو مطاع نہیں قرار دیا ہے۔ علماء صرف معلم ہو سکتے ہیں، علمبردار نہیں ہیں۔

قرآن نے اسلامی حکومت کو شوریٰ قرار دیا ہے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ

اور ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہے

اس لئے خلیفہ وقت کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا لازم ہے۔ اور قرآن کے حکم "شاورہم فی الامر" کے مطابق خلیفہ مامور ہے کہ ان اہل شوریٰ کے مشورہ سے کام کرے۔ خلیفہ اور مشیروں کی یہی جماعت حکومت کی مرکزی جماعت ہے جس کا اصولی قانون صرف کتاب اللہ ہے۔ اس نے موسیٰ نے اصول جو نشان راہ کا کام دیں بیان کر دیئے ہیں اور ہر زمان و مکان میں ہنگامی ضروریات کے لئے ضوابط بنانا انسانی عقل پر چھوڑ دیا ہے اور اس کو پوری آزادی دی ہے بجز اس کے کہ قرآن کے متعین کئے ہوئے حدود ٹوٹنے نہ پائیں۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ. ﴿۵۹﴾

ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے اس کے مطابق لوگوں میں فیصلے کر۔ مرکز و شدید تاکید کی گئی کہ قرآنی تعلیمات سے غفلت اور اس میں ذرا سی کوتاہی نہ کرے۔

فَأَحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَلَا تَأْخُذْهُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ

بَعْضُ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ﴿۶۰﴾

ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ اور ان کے خیالات کے چھوڑ جا اور

احتیاط کر کہ اللہ کے امر سے جوئے کسی حکم سے بٹا کر وہ کچھ کو فتہ میں نہ ڈال دیں۔

یعنی لوگوں کی زندگی اور معاملات سے کہیں تیرے پاسے ثبات کو قرآنی حدود سے لغزش نہ ہو جائے۔

یہ امر خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہے کہ قرآن نے ہر جگہ سند کے لئے "بما انزلنا" کو مخصوص

فرمایا ہے۔ اس لئے کہ وہی دائمی حق اور اٹل ہے۔ اس کے سوا دین اور حکومت الہی میں کوئی شے سند نہیں۔

تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد اسلامی حکومت اگرچہ خلافت کے نام سے چل رہی تھی مگر وہ مستبد شہنشاہی تھی جو قرآن کی روح سے قطعاً ناجائز ہے۔ اس لئے ملت کے سامنے صحیح نمونہ

وہی حکومت ہے جو عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں تھی۔ اب جہاں علم ایسے ہیں کہ وہ قرآن سے صحیح احکام نکال سکتے ہیں اور غلط علوم نے جو غلامی کے زمانوں میں مسلمانوں میں رائج ہوئے ان کے داعیوں کو موقوف نہیں کیا ہے ان کا فریضہ یہ ہے کہ آئینی طور پر نئے رعبہ انتخاب کے دستور ساز جماعت میں آئیں اور قرآن کے مطابق ضابطے بنائیں تاکہ وہ جمہوری ہو جائیں۔ ورنہ ان کے مطالبات محض شخصی رائیں ہیں جن کی زیادہ قیمت نہیں۔

پاکستانی حکومت جمہوری ہے جو ملک کے ہر فرد کا حق یکساں اور برابر سمجھتی ہے۔ ایسی حکومت کی اصلاح بہت آسان ہے۔ وہ اگر خلوص اور تقویٰ کے ساتھ قانون سازی میں قرآن کریم سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے قول اور عمل میں برکت دے گا اور ضروران کو کامیاب کرے گا۔

## می تو اں کر دن

ڈاکٹر سید اکرم حسین عشرت آبادان، ایران

متابع عشق و مستیہا فراواں می تو اں کر دن  
 بجز لے مرد و مضر تجھ دید چمیاں کن کہ دیندیش  
 مشو نو میداز بربادی کشت گل و لاله  
 چہ باک از قوت باطل چہ ترس از ساز و سامانش  
 اگر مرگب شرافتمند باشد مقصد کسی  
 رموز کاد و الا افتخا چوں بے پردہ تر گردد  
 کسے کو آشنائے ستر تو حید است می اند

نگاہ آتشیں بر رخسے جانان می تو اں کر دن  
 طلیح و در دل بے طرفہ دریاں می تو اں کر دن  
 کہ درویرانہ ہم گاہے بیاراں می تو اں کر دن  
 کہ کار و دست بے شمیر پیکان می تو اں کر دن  
 بگیر از سن کہ بازی با نہنگان می تو اں کر دن  
 قیامت با پیا در بنرم امکان می تو اں کر دن  
 جہاں زیر و زبر باز در ایمان می تو اں کر دن

من لے عشرت ہنوز اندر دلہم بہت خانہ با دارم  
 چساں گویم کہ کانسرا مسلمان می تو اں کر دن

# سلیم کے نام....

سلسلہ "وراثتِ ارض" — صلاحیت اور صلاحیت کا فرق

طلوع اسلام کے دورِ بول میں محترم پرویز صاحب نے "سلیم کے نام خطوط" کا ایک سلسلہ جاری کیا تھا جو اپنی افادیت اور عبادت کی وجہ سے اتنا مقبول ہوا کہ جب کبھی اس سلسلہ میں تاخیر ہو جاتی تھی تو اس کے لئے پیہم تقلصے موصول ہوا کرتے تھے۔ میں خوشی ہوئی کہ جناب پرویز نے اس سلسلہ کو کمر جاری فرمادیا۔ پہلا (اور اگر اسے دو یا زول سے مسلسل قرار دیا جائے تو غالباً دو سو اسی) خط آپ کے پیش نظر ہے۔ دیکھئے کہ ان خطوط میں جناب پرویز نہایت اہم اور مشکل حقائق کو کس سلاست اور شیرینی سے حل کر جاتے ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ اس وقت تک شائع شدہ خطوط کو ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیا جائے

یہ چیزیں نایاب ہیں اور مستقل طور پر پاس رکھنے کے قابل — مدیر طلوع اسلام [

ہاں سلیم! تم نے ٹھیک کہا۔ قریب چھ سال کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ یوں تو سال بھی صبح اور شام کے مجموعہ ہی کا نام ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ "وقت" کے لائق ہی سلسلہ پر یہ نشانات، ہم نے حساب و شمار کی سہولیت کی غرض سے لگا رکھے ہیں، جیسے گز پر گز ہیں لگا دی جاتی ہیں۔ ان گزوں کا وجود اعتباری ہوتا ہے، فی الواقعہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح دن، مہینے، سال، وقت کے گز پر گز ہیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کا وجود ہمارے ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ اگر کوئی آنکھ سورج سے اونچی جا کر زمین کو دیکھے تو اس کے سامنے ہر وقت دن ہی دن رہے گا۔ رات کبھی نہیں آئے گی۔ اس لئے اس کے نزدیک امر و فردا کا امتیاز بھی باقی نہیں رہے گا۔ لہذا جوں جوں انسان بلند یوں پر پہنچا جائے تعینات کے پردے اٹھتے جاتے ہیں۔ لیکن وقت کے اس

لاتنا ہی دریا میں واقعات کے جاب ذہن انسانی پر اپنے مستقل نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ انہی نقوش سے انسانی زندگی ترتیب پاتی ہے۔ گذشتہ چھ سال کے حوادث کو انھیں ہر ایک نگہ باز گشت ڈالو اور پھر سوچو کہ وہ جو اس مرد قلندر نے، کہ جسے بصیرت فرقانی نے محکمہ فراست عطا کی تھی، کہا تھا کہ

موجود حیرت ہوں کہ دنیا کیسے کیا ہو جائے گی

کس قدر مہنی بر حقیقت تھا۔ اس چھ سال کے عرصہ میں دیکھو کہ کس قدر تباہ کن وہ خوشنہ تاج میں جو فضا میں اڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیسی کیسی عظیم المرتبت سلطنتیں ہیں جو مٹی میں ملتی نظر آ رہی ہیں۔ کیسے کیسے بلند آہنگ دعائوی تمرد و فرعونیت میں جو سرسبز خاک سلسلے آ رہے ہیں۔ کس قدر تخریب انگیز انقلابات ہیں جو دنیا کی تصویر کی طرح نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ جو واقعات و حوادث پہلے کہیں صدیوں میں بھی گہل پڑے نہ ہو کرتے تھے، اب کس طرح دنوں بلکہ گھنٹوں میں رونما ہو جاتے ہیں۔ اس "عصر رفتار" (age of speed) نے وقت کے پہیوں میں بھی بجلیاں بھر دی ہیں۔ اس چھ سال کے عرصہ کو دیکھو اور اتنے انقلابات پر نگاہ ڈالو اور سوچو کہ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی۔ بقول تمہارے محبوب "خام ہندی" کے۔

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

اور پھر اس دور میں کو آنکھوں سے الگ کر کے "ذرا اپنے قریب کی دنیا کو دیکھو۔ وہ خواب" جو اسی مرد دانانے جس کا ذکر ابھی ابھی وجہ نشاط روح ہو چکا ہے، "سلسلہ" میں دیکھا تھا اور جس کا استقبال ہر ایک نے ہمسامہ زیر لبی سے کیا تھا کہ ان کے نزدیک یہ "شاعرانہ تخیل" اسی سلوک کا مستحق تھا۔ ہاں وہی "خواب" کس طرح محسوس پیکروں میں ہمارے سامنے آ گیا۔ اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ "خواب" "خیرین" ہمساری شامت اعمال سے، کس طرح اپنے ساتھ "تیشہ فریاد" لیکر آیا کہ جس نے ہمارے اثاثہ قومی کے ہر کلغ و کو اور متاع ملی کے ہر دعویدار کو اس طرح تودہ خاک بنا کر رکھ دیا کہ نہ لہریں صحن شیدا مذا کو سرا۔ سلیم! یہ قیامتیں کہیں باہر سے ہم پر نہیں ٹوٹیں۔ خود ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تھیں۔ دماغ اصابتک من سینئۃ فمن نفسک۔ لیکن سلیم! اس حدیث جگر بازش و داستان سینہ سوز کو اس وقت نہ چھیرو! ورنہ تمہارے سوالات کا جواب نہ جائے گا۔ میرے بریل، ہستی کے ان ناموں کے قریب مغرب



مت لاؤ کہ ان میں نفع نہیں، آگ بھری ہے۔ میں آتش خاموش کی طرح اندر ہی اندر دھبک رہا ہوں۔ میرے سینہ سوزنا کو بند ہی نہ بنے دو کہ اگر اے کسی طرف سے بھی ہوا لگ گئی تو یہ آگ شعلہ جو اللہ کی طرح بھڑک اٹھے گی۔ لہذا سلیم! مجھے رکنے دو تاکہ تمہارے شبہات کا ازالہ کر سکوں۔ غور سے منوکہ بات بڑی اہم ہے۔



تم پوچھتے ہو کہ میں نے "واحد" موضوع کے ابتدائی قانون کے سلسلہ میں "صلاحیت" اور "صالحیت" میں جو فرق بتایا ہے اس کی لم اور تفصیل کیا ہے، اگرچہ تم نے وضاحت سے نہیں لکھا لیکن اس باب میں جو شکل تمہارے سینے میں بھانسن بن کر کھٹک رہی ہے مجھے اس کا بھی پورا پورا احساس ہے۔ یہ خلش کچھ تم ہی سے مخصوص نہیں۔ کج قریب قریب ساری دنیا اسی الجھاؤ میں نظر آ رہی ہے۔ تمہارے متعلق یہ امر میرے لئے ہمیشہ باعث حسرت رہا ہے کہ تم اپنی کھٹک کو بلا تامل کہہ ڈالتے ہو۔ یاد رکھو۔ حقیقی اطمینان اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان دل میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات کو واضح طور پر بیان کر دے اور جب تک وہ بالکل عاف نہ ہو جائیں، بیچانہ چھوڑے۔ "حقیقی اطمینان" کے الفاظ میں "حقیقی" کو خاص طور پر ملحوظ رکھو۔ اس لئے کہ "جبوتے" اطمینان کی دنیا میں بہت سی شکلیں ہیں۔ لیکن اطمینان وہی اطمینان ہے جو حقیقی ہو اور یہی ایمان کی اساس ہے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھوڑی دور چھے جانا پڑے گا۔

(۱) ایک شخص سنکیا کھا لیتا ہے۔ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس لئے کہ انسان کی طبیسی زندگی ایک خاص نظام اور خاص قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ اس نظام اور ان قوانین طبیسی (*Physical laws*) نے سنکیا کو ہلاک بتایا ہے۔ اس لئے کہ یہ انسانی جسم پر ایک ایسا اثر مرتب کرتا ہے جو قاطع زندگی ہے۔ اس لئے سنکیا کھانے والے کی موت یقینی ہے۔ یہ قوانین فطرت کا تقاضا ہے اور اس کا ثبوت بدیہی۔

(۲) ایک شخص گھی کھاتا ہے۔ گھی ضد حیات ہے اس لئے اس سے اس میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اور توانائی سے زندگی کا قیام ہے۔

(۳) ایک شخص گھی خرید کر لاتا ہے۔ دوسرا شخص چلا کر لاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں پر گھی کا اثر

یکساں ہو گا یا مختلف۔ قوانینِ طبیسی کا جواب صافنا امدواضع ہے کہ گھی کے اثر پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ گھی دونوں صورتوں میں توانائی بخش اور مدیجیات ثابت ہوگا۔ اس سے ہر حالت میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

(۴) مغرب کی مادی (میکانگی) تہذیب چونکہ قوانینِ طبیسی سے ماوراکسی اور نظامِ قوانین کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے اس کے نزدیک جو شے مدیجیات اور تقویت بخش ہے (یعنی انسان۔ یا اس سے آگے بڑھے تو انسانوں کے مجموعہ یعنی قوم۔ میں زندگی کی صلاحیت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے) وہ نفع رساں ہے اور چونکہ کسی شے کے اچھے یا برے ہونے کا معیار لامحالہ یہی ہے کہ وہ نفع رساں ہے یا نقصان دہ۔ اس لئے ذریعہ حصول کو اس فیصلہ میں کوئی دخل نہیں۔ گھی اچھی چیز ہے خواہ کسی طریق سے حاصل کیا جائے۔ سنسکیا بری چیز ہے خواہ ذریعہ حصول کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

(۵) تم یہ کہو گے کہ اہل مغرب جب چوری کو میوب قرار دیتے ہیں اور قانون کی رُو سے جرم۔ تو وہ لامحالہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "چوری کا گھی" بری چیز ہے اور خریدنا ہو گھی "اچھی چیز۔ لیکن ہم نے ابھی ابھی اوپر دیکھا ہے کہ قوانینِ طبیسی کی رُو سے گھی کا اثر ایک ہی ہوتا ہے خواہ وہ سرودہ ہو یا خرید کردہ۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ مادی تہذیب کی رُو سے چوری کا گھی اور نیچہ پیدا کرتا ہے اور خرید کردہ اور۔ لہذا "بات زیادہ سے زیادہ یوں ہوتی کہ

(ا) گھی بہر حال اچھی چیز ہے۔

(ب) چوری بری چیز ہے۔

شن (ب) یعنی "چوری بری چیز ہے" قوانینِ طبیسی سے متعلق نہیں۔ ضابطہ اخلاق (Code of Ethics) سے متعلق ہے۔

لیکن جب انسان کی زندگی صرف قوانینِ طبیسی کے ماتحت ہے تو میری ضابطہ اخلاق کیا ہے؟ زہر، چوری، ڈاکہ، دھوکا، فریب سے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس سے اٹھ خریدتا ہے۔ اپنے گرد ایک جماعت پیدا کر لیتا ہے۔ خود بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے متوسلین کو بھی آسائش و راحت کے سامان

قرآن کریم کی کہ دیتا ہے۔ دوسری طرف عمرؓ صبح سے شام تک محنت کرتا ہے۔ بڑی شکل سے چارپے حاصل کرتا ہے۔  
 عمر عسرت سے دن بھر کرتا ہے۔ زندگی بڑی تنگی سے گزارتا ہے۔ زید بھی مر جاتا ہے۔ عمرؓ کی۔ دونوں کا  
 معاملہ رومانہیں طبیبی کی نوے) ختم ہو جاتا ہے۔ ضابطہ اخلاق کی پابندی نے عمر کو کیا دیدیا اور اس کی شکست و  
 روکیت نے زید کا کیا بگاڑ دیا؟ لہذا ضابطہ اخلاق سے فائدہ کیا ہے!

مغرب کا معلم اخلاق ہے جو اب دیتے ہے کہ ضابطہ اخلاق سے سوسائٹی کا نظام قائم رہتا ہے۔ یعنی  
 ہر ریٹ اسپنسر کے الفاظ میں (وی ہر ریٹ اسپنسر سلیم! جس کے "First principles" کے کبھی  
 تم بہت دلدور ہو کرتے تھے)۔ ہاں اسی ہر ریٹ اسپنسر کے الفاظ میں۔ اخلاق خوف انتقام (Fear for  
 Revenge) کی پیدا کردہ چیز ہے۔ یعنی میں چوری اس لئے نہیں کرتا کہ ڈرتا ہوں کہ اگر اسے معیوب نہ قرار  
 دیا گیا تو میری بھی کوئی چیز محفوظ نہ رہ سکے گی۔ میں کسی کو فریب اس لئے نہیں دیتا کہ مجھے خوف ہے کہ اگر اس پر  
 پابندی نہ لگائی گئی تو مجھ سے زیادہ شاطر و عیار مجھے فریب دے جائے گا۔ لہذا، اخلاقیات کی ذاتی طور پر  
 کچھ قیمت نہیں۔ یہ نظام سوسائٹی کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اور اس کی بنیاد خوف انتقام اور پولیس  
 عدالت، جیل، سب اسی جذبہ خوف کو برقرار رکھنے کے ذرائع۔

اس کا مطلب، سلیم یہ ہوا کہ اگر میں ایسا انتقام کر لوں کہ مجھے خوف انتقام نہ ہے۔ یعنی میں کسی  
 پولیس والے کے قابو نہ آسکوں۔ اور اگر قابو آجی جاؤں تو عدالت پر اثر ڈال لوں۔ یا اتنی طاقت حاصل کر لوں  
 کہ کسی دوسرے کو مجھ سے یا راتے انتقام ہی نہ رہے۔ تو پھر میرے لئے اخلاق کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تمہیں  
 معلوم ہے کہ اب یورپ میں ہو کیا رہا ہے! وہاں اب "ذہنوں کی جنگ" (Battle of wits)  
 ہو رہی ہے، ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ میں ایسا انتقام کر لوں کہ دوسرے کو دھوکا دے جاؤں لیکن اُسے پتہ  
 نہ چلے۔ جرم کرتا ہوں لیکن پکڑا نہ جاؤں۔

لیکن اس صورت میں پھر جرم کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس کے لئے خدا اور آگے بڑھو۔ اگر کوئی سوسائٹی  
 یہ فیصلہ کرے کہ اپنے قبیلہ یا اپنی قوم میں چوری کرنا، فریب دینا، جرم ہے، لیکن دوسرے قبیلہ یا دوسری  
 قوم کے ساتھ یہ سب کچھ روا ہے۔ تو پھر ان افعال میں جرم کا احساس بھی نہیں رہے گا۔ قدیم رومیوں میں

یہی قانون تھا کہ غیر رومیوں کے ہاں چوری کر لینا میسر نہیں۔ اس کی تقلید یورپ کی نیشنلزم نے کی ہے۔ ہر وہ کام جس سے اپنی نیشن کو تقویت بخشتی ہے۔ حب الوطنی (Patriotism) کا جوہر لے ہوئے ہے۔ لہذا درخوردستانوں۔ اب وہی جنگِ عقول (Battle of wits) جو ایک قوم کے افراد میں باہدگر تھی۔ مختلف اقوامِ عالم میں سرگرم عمل ہے۔ اب ہر قوم دوسری اقوام کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ کرنا اس کو فقط اتنا بولتا ہے، کہ اتنی قوت فراہم کر لے کہ اسے خوفِ انتقام نہ رہے۔ اسی کا نام ان کے ہاں صلاحیت ہے۔ یعنی ان کے نزدیک مذہر رہنے کی صلاحیت اس قوم میں ہے جو خوفِ انتقام سے مامون ہو جائے اور پھر کچھ جی میں آئے کرے۔

یہ ہے سلیم! حاصل مغرب کی مادی (یا میکائلی) تہذیب کا، اور یہ ہے مفہوم صلاحیت کا۔ یعنی گمی بہ نفع تو اتانی بخش ہے۔ خواہ خرید کر لو، خواہ چر کر۔ اور چوری کرو تو اس انتہام کے ساتھ کہ نہیں خوفِ انتقام در ہے۔ مگر تم نے ایسا کر لیا تو ہر مذہب چوری کا گھی کھاؤ۔ تم میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

یہ ایک پنج فکر ہے۔ دوسری طرف ایک اور سلو پ فکر ہے جس کی دعوت اس بنیاد پر ہے کہ انسان کی طبعی زندگی طبعی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن زندگی صرف طبعی ہی نہیں اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ طبعی زندگی حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن مقامِ انسانیت سطحِ حیوانیت سے ایک درجہ آگے ہے۔ انسانی زندگی کی اس خصوصیت کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ غرض نام سے نہیں۔ اس حقیقت سے ہر جس کا تعارف اس نام سے کر لیا جائے۔ مقامِ انسانیت کی یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو قوانینِ طبعی کے تابع نہیں ہیں۔ اسلئے اس کا سلسلہ بھی سائنس کی آمدورفت تک محدود نہیں۔ تارنفس کے ٹوٹنے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم رہتا ہے۔ یہ وہ ہے جسے سلیم! میں طرفِ انسانیت کہہ کر پکارا کرتا ہوں۔ جسے حضرت علامہ (اقبال) قوی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تم اسے صبح کہہ لو۔ جس طرح انسان کے جسمانی قوی کی پرورش اور تعمیر ایک خاص نظام کے ماتحت ہوتی ہے، اسی طرح اس شے دیگر شرفِ انسانیت یا خودی کی تربیت و بنگلی بھی ایک خاص

صابطہ آئین کے تابع ہوتی ہے۔ اس امتیاز کے ماتحت 'گمی' اور 'مسروقہ' دو الگ الگ چیزیں ہوجاتی ہیں۔ گمی اپنا تمبر قانون طبیسی کے مطابق مرتب کرتا ہے۔ 'مسروقہ' اپنا تمبر اس دوسرے قانون کی نو سے مشکل کرتا ہے۔ اس قانون کو قانون مکافات عمل کہتے ہیں جو جہاں مثبت سے متعلق ہے۔ خدا کی ذات ان دونوں نفاہائے قوانین (قوانین فطرت اور قوانین مشیت) کی نگران ہے۔ چنانچہ جہاں اس کا قانون فطرت یہ دیکھتا ہے کہ گمی کا تمبر جسم انسان کے لئے قوت بخش ہونا چاہئے وہاں اس کا قانون مکافات اس پر ہی لگا رکھتا ہے کہ 'مسروقہ' کا تمبر زوال شرف انسانیت یا صعب خودی ہونا چاہئے۔ اور چونکہ یہ ضوابط قوانین اہل میں اس لئے ان کے نتائج بھی اہل میں۔ قوانین فطرت کے مطابق عمدہ نتائج کا حاصل صلاحیت ہے اور قوانین مکافات کے مطابق عمل خیر کا حاصل صلاحیت۔ قرآن ان دونوں ضوابط قوانین کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی صلاحیت میں صلاحیت بھی خود خود آجاتی ہے۔ لیکن فکر مغرب کی صلاحیت میں صلاحیت نہیں آتی۔ سمجھے سلیم!

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صلاحیت سے نظام سوسائٹی خود بخود صحیح خطوط پر قائم رہے گا۔ لہذا وہ ضابطہ اخلاق جسے معلمین اخلاق نے نظام سوسائٹی کے قیام کی خاطر وضع دیا اختیار کیا تھا، اس نظام مکافات عمل کا ایک طبیسی نتیجہ (Natural Corollary) ہو گیا۔ مقصود بالذات نہ رہا۔ قرآن کا نفاذ نظام مطہرہ کو بھی صحیح خطوط پر قائم رکھتا ہے اور ارتقائے شرف انسانیت کی منازل طے کرانا سہوا، انسانی خودی کو اس زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔ لہذا نظام سوسائٹی کا قیام اس سفر میں سنگ میل یا چراغ راہ بن کر رہ جاتا ہے۔ منزل مقصود اس سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ یعنی اس تجارتِ عظمیٰ کا محض (By-Product) ہوتا ہے۔

۱۰۔ اس مقام پر سلیم ایک اور چیز کی طرف بھی خود کرتے جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ ہمارے ہاں جب قرآنی افامرو نواہی کی حقانیت پر بحث کی جاتی ہے تو سارا زور اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ ان قوانین کی پابندی سے سوسائٹی کا نظام بہترین انداز سے چل سکتا ہے اور قطع میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے بہتر نظام سوسائٹی مرتب ہی نہیں ہو سکتا۔ گویا نظام قرآنی سے مقصود سوسائٹی کے نظام کو بہترین خطوط پر مشکل کرنا ہے۔ اور بس۔ یعنی جو چیز اس نظام کی محض (By-Product) ہے۔ ان کے نزدیک وہ ایک اصل مقصود ہے۔ (بقیہ حاشیہ پر صفحہ آئندہ)

سوسائٹی کا نظام ہر ایسے ضابطہ کی رو سے چل سکتا ہے جسے افراد سوسائٹی متفقہ طور پر تسلیم کر لیں۔ اس لئے اس نظام کو چلانے والے ضابطہ کی کوئی مستقل ذاتی قدر (Intrinsic value) نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی سوسائٹی متفقہ طور پر طے کر لے کہ مرد اور عورت کے تعلقات کے لئے مناکت کی ضرورت نہیں۔ یہ خالص طبیسی جذبہ ہے جس کی تسکین باہمی رضامندی سے ہر جگہ کی جاسکتی ہے۔ باقی رہے اس تسکین جذبات کے نتائج یعنی اولاد تو ان کی ہموارش و تربیت کا انتظام خود سوسائٹی (حکومت) کی طرف سے ہو جائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس سوسائٹی کا یہ نظام بھی چل جائے گا۔ اس صورت میں اس سوسائٹی کے ضابطہ اخلاق میں زنا کا لفظ تک بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض نظام سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لئے جو ضابطہ اخلاق مرتب کیا جائے گا اس کی ذاتی حیثیت (Intrinsic value) کچھ نہیں ہوگی۔ اگر ایک وقت میں مناکت اخلاقی حسنہ کا جزو قرار پائے گی تو دوسرے وقت بے باکانہ تسکین جذبات ہی حیثیت اختیار کر لگی۔ مثال کے طور پر آج دینائے اقتصادیات میں ربا (دسود) کو نظام سوسائٹی نے متفقہ طور پر جائز تسلیم کر لیا ہے۔ لہذا یہ نہ ان کے ضابطہ اخلاق کی رو سے معیوب ہے، نہ کسی قانون کی رو سے جرم۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فکر مغرب کی رو سے ربا (دسود) فی ذاتہ نہ معیوب ہے نہ مستحسن۔ اگر سوسائٹی اپنے نظام کے قیام کے لئے اسے متفقہ طور پر معیوب قرار دیدے تو یہ معیوب ہو جائے گا اور اگر متفقہ طور پر اسے اختیار کر لے تو یہ مستحسن قرار پایا جائے گا۔ جس طرح یورپ میں بائیں طرف چلنا قانونِ راہِ روی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا، لہذا مغربی بیچ فکر کے مطابق ضابطہ اخلاق کے اجزاء اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں رکھتے۔ جس چیز کو معاشرہ متفقہ طور پر اختیار کر لے وہ مستحسن (اور جو اس کے خلاف کرے وہ مجرم) اور جس شے کو وہ متفقہ طور پر رد کر دے، وہ معیوب (اور اس سے

دہلیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس نظام میں سوسائٹی کا نظام بہترین خطوط پر شکل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اس نظام کا آخری نتیجہ نہیں ہے۔ نظام انسان میں وہ صالحیت پیدا کرتا ہے جس سے یہ صرف انسانیت کی بلند منازل طے کرتا ہوا اپنے اندر اس زندگی سے اگلی زندگی کی سرفرازیوں کی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ یہ ہے اس نظام کا مقصود۔ اس لئے قرآنی نظام کو ہمیشہ اس حیثیت سے دیکھنا اور اسی حیثیت سے پیش کرنا چاہئے۔ اسی سے تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ ایمان بالآخر کا مفہوم اور اس کی اہمیت کیلئے۔ ان امور کی وضاحت نہیں عارف القرآن میں ملے گی۔ مجھے تہمید خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم اسے معنی 'ناول' کی طرح نہیں پڑھ رہے۔

اعتناء کرنے والا شریف) لیکن ضابطہ قانون مکافات کی رو سے ہر چیز اپنی ایک مستقل قدر (value) رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح عالم طبیعی میں اشیاء کے خواص، انسانوں کے فیصلوں کی رو سے تبدیل نہیں ہوتے۔ اسی طرح عالم مشیت (یعنی قانون مکافاتِ عمل) میں بھی اشیاء کے خواص انسانوں کے فیصلوں کی رو سے نہیں بدلتے۔ مثلاً سنسکریا قاطع حیات ہے۔ اگر تمام دنیا کے انسان مل کر فیصلہ کر لیں کہ۔ آج سے ہم سنسکریا کو مہدیات سمجھیں گے تو اس فیصلہ سے سنسکریا کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ وہ حق ہے (یعنی اپنی خاصیت میں مثل) اس لئے وہ اکثریت کی رائے کے تابع نہیں چلتا۔ اسی طرح روبا (یا مثلاً جھوٹ) قاطع شرفِ انسانیت ہے۔ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی فیصلہ کر دیں کہ آج سے ہم روبا (یا جھوٹ) کو مہدی نظام سوسائٹی قرار دہیں گے تو وہ اپنی تاثیر کو نہیں بدلتا۔ اس لئے کہ اس کا قاطع شرفِ انسانیت ہونا بھی حق ہے اور حق انسانوں کے فیصلوں کے تابع نہیں چلا کرتا۔ ولواتبع الحق اہواءہم لفسدت السفوت والارض ومن فیہن۔ اگر حق لوگوں کے خیالات کے تابع چلنے لگ جائے تو تمام کائنات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔ پھر جس طرح سنسکریا کو اپنی تاثیر مرتب کرنے کے لئے ایک مستقل نظامِ طبیعی کی ضرورت ہے۔ جسمانی نظام میں نہ معلوم کیسے کیسے عظیم اور لطیف تغیرات رونما ہوتے ہیں، تب کہیں جا کر سنسکریا کی سمیت منج بہ ہلاکت ہوتی ہے، جسمانی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ کو اپنا ہلاکت انگیز یا صداقت کو انسانیت پروردہ تنظیم مرتب کرنے کے لئے بھی ایک عظیم الشان نظام کی ضرورت ہے۔ یہ نظام ایسا ہے کہ اس میں مجاہد کی خفیت سی جنبش اور دل کی ہلکی سی لرزش تک بھی بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یروہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرارہ۔ اسی حقیقت غیر متبدلہ کا اعتراف اللہ پر ایمان کہلاتا ہے۔ مغرب کے علمائے فطرت، نظامِ قوانینِ طبیعی کو مثل مانتے ہیں لیکن وہ اسے بالعموم اندھی فطرت کا میکا کی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظام ایک بلند و بالا ہستی کا چلا یا ہوا ہے اور اس طرح وہ خدا کی ہستی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن تسلیم! غور کرو کہ خدا پر اس قسم کے ایمان کا کچھ نتیجہ بھی ہوتا ہے؟ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ چاند سورج، ستارے، زمین، سب اتفاقی طور پر گردش کے سلسلہ طبیعی میں جکڑے ہوئے ہیں اور میکا کی عمل سے رواں دواں ہیں۔ اور دوسرا شخص کہتا ہے کہ نہیں۔ انہیں

خدا نے بنایا ہے اور یہ اسی کے قائم کردہ نظام کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ کہتے کہ جہاں تک دنیائے انسانیت کا تعلق ہے، اول الذکر کے انکار سے کیا زیاں ہوتا ہے جو ثانی الذکر کے اقرار سے پورا ہوجاتا ہے! زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ثانی الذکر نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن وہ بات سلیم! اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ اس اقرار حقیقت سے دنیائے انسانیت میں کیا فرق پڑتا ہے۔ خدا پر حقیقی ایمان شروع ہی اس حقیقت کے اعتراف سے ہوتا ہے کہ اس کے نظام میں انسان کا کوئی عمل اور کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی اور نہ کبھی غلط نتیجہ ہی مرتب کر سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں متعدد بار آیا ہے کہ ولئن سألکم من خلق السموات والارض ومنھما الشمس والقمر۔ اگر تو ان سے پوچھے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے۔ ليقولن الله۔ یہ اقرار کریں گے کہ اللہ نے۔ یعنی وہی ایمان جو مغرب کے علمائے فطرت میں سے خدا کو ماننے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس اعتراف کے باوجود یہ الٹی الٹی راہیں چلتے ہیں (فانی یوفلون۔ ۳۳) تو یہ اس لئے کہ ان کا ایمان فقط نظام طبیعی کے خالق پر ہوتا ہے، نظام مکافاتِ عمل کے خدا پر نہیں ہوتا۔ لہذا مغرب کی میکائیلی تہذیب میں

(۱) یا تو خدا کی ہستی سے کلیتہً انکار ہی ہوتا ہے۔

(۲) اور اگر کہیں اقرار بھی ہوتا ہے تو فقط نظام طبیعی کے خالق پر۔

(۳) اس کے بعد وہ نظام معاشرت (سوسائٹی) کے قیام کے لئے خود قاعدے مقرر کر لیتے ہیں۔

اسی کو ضابطہٴ اخلاق کہتے ہیں۔ جس کی حیثیت فقط اتنی ہوتی ہے کہ انسانوں نے منفقہ طور پر

اس ضابطہ کو اختیار کر لیا ہوتا ہے۔ جیسے یورپ میں سڑک کے بائیں طرف چلنا، قانونِ راہروی

سہ اور سڑک میں دائیں طرف چلنا۔

(۴) اور ان ضوابط پر پابندی کا محرک جذبہٴ خوب انتقام یا مواخذہٴ قانون ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس

خوف سے مامونیت کا انتظام کر لے تو پھر اسے اس پابندی کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۵) اس نظام کی پابندی سے جماعتی قوت حاصل ہوجاتی ہے جو تخمیر قوائے فطرت کے ساتھ مل کر

اس قوم میں طبیعی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔



(vi) اور چونکہ زندگی ان کے نزدیک فقط یہی طبعی زندگی ہے اس لئے جس طریق سے یہ صلاحیت حاصل ہو جائے وہی طریق مستحسن قرار پایا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، اس دوسری تہذیب کی رو سے حسی کا ذکر اور پراچکا ہے۔

(ا) نظام طبعی کے علاوہ ایک اور نظام بھی ہے جسے نظام مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اس نظام میں ہر عمل کا ایک نتیجہ متعین ہوتا ہے۔ اور کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ اعمال کے نتائج دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جس سے شرفِ انسانیت (انسانی خودی) کی نشوونما اور بالیدگی و برومندی ہوتی ہے اور دوسرا وہ جس سے اس میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

(ب) نظام طبعی کی پابندیوں سے طبعی زندگی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اس نظام مکافاتِ عمل کے ابتداء سے انسانی زندگی میں صالحیت پیدا ہوتی ہے۔

(ج) صالحیت میں، صلاحیت خود بخود آجاتی ہے لیکن صرف 'صلاحیت' میں 'صالحیت' نہیں آسکتی۔ اس سے سلیم، ایم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ

(۱) مغرب کے مہکانی نظام میں طبعی زندگی کی صلاحیت مقصود ہے۔

(۲) قرآن کے نظام ایمان و عمل میں طبعی زندگی کی صلاحیت کے ساتھ ماورائے حیاتِ طبعی کی صالحیت بھی آجاتی ہے۔ اور

(۳) عجمی اسلام کے نظام تنویم میں نہ صلاحیت ہوتی ہے نہ صالحیت۔ خسر لفظیاً والا فرہ و ذالک خسران البین۔

بکسی ہائے نسا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

۴

کیوں سلیم! ملا جواب تمہارے سوال کا؟ سمجھ گئے فرق صلاحیت اور صالحیت میں؟ اب آگیا تمہارے ذہن میں کہ جو وراثتِ ارضِ خدا کی طرف سے ملتی ہے، وہ مشروطہ بصالحیت ہوتی ہے۔ لیکن جو حکومت و سلطنت فقط صلاحیت (مادی قوت) کا نتیجہ ہوتی ہے وہ ابلسی نظام کی عطا کردہ ہوتی ہے، اور جس میں وہ ملتی ہے نہ یہ۔ وہ ہم ہندی مسلمانوں کا عجمی اسلام ہے۔

میں نے سلیم! اس خط میں دانستہ اس بات کو نہیں چھیڑا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ (i) طبیسی زندگی کے علاوہ انسانی زندگی میں کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ (ii) قوانین فطرت کے علاوہ، قوانین مکافاتِ عمل بھی ہیں۔ (iii) ان قوانین کی رو سے اعمال کے نتائج متعین امدان کی اقدار (Values) مستقل ہیں۔ میں ان چیزوں کو بطور حقیقت ثابتہ بیان کر گیا ہوں۔ علمی طور پر انھیں پیش نہیں کیا۔ میں نے اس وقت دانستہ اس بحث کو نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ اس سے بات، تمہارے سوال سے بہت دور نکل جاتی۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ان چیزوں کو محض عقیدہ نہیں مان رکھا۔ علمی وجہ البصیرت مانا ہے۔ اس لئے انھیں علمی وجہ البصیرت سمجھا بھی سکتا ہوں۔ لیکن اسے کسی دوری فرصت پر اٹھا رکھو۔ سید دست اگر تم انہی باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ لو جو اس خط میں سامنے آگئی ہیں تو مجھے امید ہے کہ تمہارے بہت سے الجھاؤ اس سے دور ہو جائیں گے۔ امید اس لئے ہے کہ تمہارا قلب سلیم ہے اور سعادت و ہدایت کی راہیں اسی کے لئے کشادہ ہوتی ہیں من اتی اللہ بقلب سلم۔ جو اللہ کی طرف قلب سلیم لیکر آئے۔ عم مروجم نے سلیم! تمہارا نام بھی کس قدر تمہاری فطرت کے عین مطابق رکھا ہے۔ تم بڑے ہی خوش بخت ہو۔ اچھا۔ خدا حافظ

دعاگو

پروفیزر

میں ملتِ اسلامیہ کے مقاصد و واجبات کیا ہیں۔ اور ہمارے حکام اور عوام کو کیا کرنا چاہئے؟ ویسے تو ان مقاصد کو  
نواجز تک پھیلایا گیا ہے۔ لیکن جامعیت اور بجا کی زبان میں دیکھنا ہو تو ان نواجز کے آخری دو جز ان  
تمام مقاصد کو جامع اور محیط ہیں۔ آٹھویں جز میں کہا گیا ہے کہ

عاجزہ اس وقت سر پر منڈلا رہا ہے اس کی مدافعت کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار  
کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اگر خطہ زمین ہی نہ رہا تو ہم بھی نہ رہیں گے۔

اس جز کا مقصد تحفظ و دفاع و استحکام پاکستان ہے۔ اور معلوم ہے کہ اس وقت ملتِ اسلامیہ کا  
سب سے اہم اور بنیادی مقصد یہی ہے اور یہی ہونا چاہئے۔

نویں جز میں مرقوم ہے کہ

اور ان سب ساعی کا حاصل یہ ہو کہ جس غرض کے لئے یہ زمین کا کھڑا ہم نے حاصل کیا ہے یا بالفاظِ  
صحیح ہیں اس مبدرفیض و کرم کی موجب کبریٰ سے غایت ہوا ہے وہ غرض بطریقِ انسب پوری  
ہو جائے۔ اور وہ غرض اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس خطہ ارض میں بسنے والا مسلمان تمام دنیا کی غیر  
فطری فلاحی کی زنجیروں کو توڑ کر فقط ایک اللہ کا محکوم ہو کر زندگی بسر کر سکے۔ اور اس طرح پھر سے  
اس آئین کہن کو تازہ کر دے جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک  
سرگرداں ہے۔ یا رب ایں آرزو کے من چہ خوشی است۔

ان دونوں مقاصد میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو اس وقت ملتِ اسلامیہ کے مرکز و جوار مرکز نظر ہے اور جن میں  
"مقاصدِ تسعہ" یعنی نواجز میں پھیلایا گیا ہے۔

سٹے تو میرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

یہاں تک تو ملتِ اسلامیہ کے لئے سمبت سفر اور منزل مقصود متعین کی گئی۔ اور ان میں بتایا گیا کہ  
حصولِ پاکستان سے ان کی منزل ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی منزل تو ابھی باقی ہے جس تک پہنچنے کے لئے کا وہاں  
ملتِ اسلامیہ کو جا رہا ہونا چاہئے، سو اگر طلوعِ اسلام میں اسی پر اکتفا کرتا۔ اور کا وہاں ملت کو جا رہا ہونا  
ہونے کی تلقین کر کے خود جا رہا ہونا چاہئے۔ تو طلوعِ اسلام کے مطالعہ سے ایک عازم سفر محقق کی تسکین

ہرگز نہ ہو سکتی۔ لیکن بھلا اللہ ہم لمعات میں دیکھ رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام وقف انتظار نہیں۔ بلکہ اس نے مسئلہ مقصود کی طرف قدم بڑھا دیا ہے اور وہ یہ کہ طلوعِ اسلام کو پاکستان کی دولتی پالیسی پر جس مخلصانہ اور تعمیری تنقید کی ضرورت ہے۔ اس سے وہ چکچکیا نہیں، اور اس حق گوئی کو میں طلوعِ اسلام کا منزل مقصود کی طرف جاہ پیا اور گا مزن ہونا سمجھتا ہوں۔ اور یہی چیز ہے جو نہ صرف میرے لئے بلکہ طلوعِ اسلام کے تمام مخلص کارکن کرام کے لئے موجب ايقان اور وجہ تسکین ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ لمعات میں طلوعِ اسلام نے آل انڈیا مسلم لیگ کے دو حصوں میں تقسیم ہونے اور ہندوستان کی مسلم اقلیت اور پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی ترجمانی کا صحیح آئینہ دار ہے۔ لمعات کا یہ لمحہ ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں جیسا کہ قائد اعظم محمد علی جناح نے فرمایا ہے۔ اس وقت پاکستانی مسلمان کا ذہن اس چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ غیر مسلم بھی اس کی قوم کا جزو بن سکے ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان کے مسلمان نے مسلسل دس برس تک اس ایک سوال پر ہندو اور انگریزوں سے جنگ لڑی ہے اور اس بنیادی فرق کی بنا پر دین سے جدا گانہ حتی استقلال منوایا ہے اس لئے ابھی اس کا ذہن اس نظریہ قومیت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی قومیت سے الگ کر کے اپنی قومیت کے دائرہ کو محض پاکستانی حدود یا وحدتِ حکومت کے نظریہ پر قائم کر لیا۔ تو رفتہ رفتہ اول الذکر نظریہ ذہن سے اوجھل ہو جائے گا اور بنا بر وحدتِ حکومت یا وحدتِ وطن پاکستان کا مسلمان بیاں کے غیر مسلم کو اپنا ہم قوم سمجھنے میں کچھ بھی تردد محسوس نہیں کرے گا۔ ہمارا آج کا اسلام چندہ سو سال پیشتر کے حقیقی اسلام سے اسی صورت میں مختلف ہوا ہے کہ جب کوئی بات ابتداء اپنے مرکز سے سرکی، تو ہم نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اور رفتہ رفتہ تصور سے عرصے کے بعد اس نے اصل شے کی جگہ اختیار کر لی اور یوں وضع

تھا جو تا خوب بتدریج وہی خوب ہوا

اور یہی خطرہ ہیں اس باب میں محسوس ہوا ہے۔

آگے چل کر ہندوستانی مسلمان کی حفاظت اور اس کی ذمہ داری کے متعلق لکھا ہے

اور ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان کی تفریق پیدا ہی کیوں کی جائے۔ یہ بیان کے دس کروڑ مسلمانوں کا مشترک مسئلہ ہے اور اگر پاکستان کا مسلمان اسے اپنا مسئلہ نہیں سمجھتا اور یہ خیال کر کے مطمئن ہو جانا چاہتا ہے کہ جس کے سرٹری ہے وہی جھگٹے گا۔ مجھے میرے پاکستان سے واسطہ ہونا چاہئے۔ تو قسم ہے اس خدا کے ذوالجلال کے قانونِ مکافاتِ عمل کی جس کی مہربتِ عظمیٰ نے پاکستان کا خطہ زمین انعام فرمایا ہے کہ دنیا اور عاقبت دونوں کی خوشیوں اور ذلت و خرابی ایسے مسلمان کے سر نہ لاری ہے۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

• طلوعِ اسلام کے ان بلند اسلامی و ملی مقاصد و عزائم کو دیکھ کر سر نہ ہنسیہ و غلص اور دریدل رکھنے والے مسلمان کے دل میں اس کے لئے قدر و محبت کا جذبہ پیدا ہونا اور اس کے ساتھ متفق و موافق ہونا ناگزیر امر ہے۔ طلوعِ اسلام کی یہ آواز سرحد کے غیر نوجوانانِ اسلام اور فرزندانِ توحید کے دل کی آواز ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ طلوعِ اسلام کو اپنے مقاصدِ جلیلہ میں کما حقہ کامیاب فرمائے اور ملتِ اسلامیہ کو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں مدد دے۔

وَبِرَحْمَةِ اللَّهِ عَزِيزًا آمِينَ

مرزا راشد مردانی عفی عنہ

سابق ناظم اعلیٰ جمعیتہ العلماء صوبہ سرحد مردان

+

(۲) بوی کے ایک مرغِ رشتہ بریا کی نوائے سوز جو ہمیں

بگوتر بامِ حرم سمجھتا ہے!

مترجمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دین میں کا جملہ یا مرتبہ تاثراتِ روحی سامنے آیا۔ آفتابِ سعادت کی ہر شعاع، سحر ایمان کا پیغام، طلوعِ سحر کی ہر نوا، بانگِ دل۔ انتہائی ادبی دنوں اور یوں کے ساتھ عبرت و نصیحت کے دریا کو شرو و نسیم کی

نہیں جاری ہیں، خدا کرے کہ یہ ایمانیات کی بارشیں، ذرات حیات کی پیاسیں بڑھائیں اور سفینہ طلب کو جتوئے ساحل سکھائیں۔ سچیکو مشکورا۔ سچ تو یہ کہ تبصرہ گرامی نے ہزاروں آنکھوں سے پروے اٹھا دیے ہیں مگر بظاہر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی ہے کہ یہ چیز ان سب آنکھوں تک پہنچ جائے گی۔ خیر مقصود تو پیغام قرآنی کا پہنچانا ہے۔ کسی نظام کا ہر جزو جب اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا وہ کام جو مقصد نظام کے تحت میں کرنا چاہئے، کرنے لگتا ہے تو ہر شکل خود بخود پھیل ہونے لگتی ہے۔ ایک ولی اور ہم مشربی اگر غائبانہ کافی متصور ہو تو دعا ہے کہ آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں مگر یہاں تو یہ حال ہے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی خود ہماری خبر نہیں آتی

نیارائے سکوت، نہ مجال گفتگو، نہ کچھ کہا جاتا ہے، نہ سنا جاتا ہے، نہ اجازت ہے، نہ رخصت۔ اگر سب متحد خیال، مقدا عمل بھی ہو جائیں تو پھر گرنے قطراتِ شبنم، گرے نہ رہے، بارش نیاں بن جائے۔ مگر یہ کہیں ہو، نہ قوت ہموار، نہ بال و پر سے بے نیاز۔ کعبہ، قلب زمین ہی، مگر مردہ، خیر، قلب کو کس طرح پائے، بے سراپا تڑپتے رہ گئے، سرمایہ دار سچ کر کے واپس بھی آگئے۔ حاصل یہ ہے کہ مرکزیتِ دل و دماغ ضروری ہے مگر وفائات میں کیوں کر حاصل ہو۔

درس نہ دے قرار کا یوں دل بے قرار کو جلوں کے ماسوی بھی کچھ چاہئے اعتبار کو

ذرے آفتاب بن کر ایک ہمہ گیر پیغامِ بحر دے سکتے ہیں مگر شرط مرکز واحد پر جمع ہو جانا ہے، تحریک مبارک ہے، کاش کہ کبھی سب ایسے منتشر عناصر کی طرح متحد ہو کر شاہانِ مقصد کام کر سکیں۔ مرکز اس لئے مانگتے ہیں کہ شیرانہ نظام قائم ہو، اور نظام اسی لئے عزیز ہوتا ہے کہ بغیر نظام زندگی کا خیال، محال۔ خدا کرے کہ یہ خواب اپنی صبح تعبیر پوائے۔ آرزوں نے دیکھا ہے کہ ذرے پھر سے اپنے آفتاب کی روشنی سے فضاؤں کو منور کر رہے ہیں اور صبح سعادت کے انوار سے دامنوں کو بھر رہے ہیں۔

(۳) طلوع اسلام کی اشاعت مارچ ۱۹۳۸ء کے لمعات میں ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ اس

عام جذبہ مرحومیت اور خوشامد نظر زعم پر تبصرہ کیا تھا جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں

میں تقسیم کے بعد پیدا ہو چکا ہے اور جس کا مظاہرہ انھوں نے خصوصی طور پر جانا گا ندی کے ساتھ اظہار عقیدت میں کیا ہے۔ یوپی کے ایک صاحب نے ہمارے ان خیالات سے خدمت اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ ان کے مکتوب کا سلفہ حصہ درج ذیل ہے۔

تعارف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ صاحب مکتوب اُن محدودے چند بزرگوں میں سے ہیں جو پاکستان پر اعتقاد ایمان رکھتے تھے اور بدستور اس عقیدہ پر قائم ہیں۔

طلیح اسلام کے ماہ مارچ ۱۹۴۷ء میں "لمعات" کے زیرِ عنوان ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت دوسرے بزرگراف میں جن خیالات کا آپ نے اظہار فرمایا ہے مجھے ان سے سخت اختلاف ہے۔ میرے نزدیک آپ نے بالکل جذبات کی رو میں یہ مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو کچھ گزری ہے اور جن ہوناک حالات سے انھیں گزنا پڑا ہے وہ انھیں ہی معلوم ہیں جن پر وہ حالات گزرے ہیں۔ آپ کو ان کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

بیشک تعلق چالیسی اور مابست بری اور بہت ہی بری عادتیں ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ بری عادتیں آج پیدا نہیں ہو گئیں یہ بہت پہلے سے چلی آرہی ہیں۔ ہم نے (یعنی ہماری سب سے بڑی نمایندہ جماعت نے) ان بد عادتوں کو دور کرنے کی کوشش کب کی تھی۔ قوم کی سیرت تعمیر نہ کرنا اور حکومت قائم کرنا بیٹھا سخت سیاسی غلطی ہے۔ قوم کی سیرت تعمیر کرنا تو درکنار ہم نے تو اپنے اپنی کمانڈ کی بھی سیرت کی تعمیر نہیں کی۔ میں پوچھتا ہوں کہ مسلم لیگ کی سیاسی تنظیم کی حقیقت کیا تھی؟ دین کے سامنے ہم جو کچھ چاہیں مگر واقعہ اور حقیقت یہی ہے کہ مسلم لیگ شروع سے آخر تک قائد اعظم کا نام تھا اور بس۔ قائد اعظم کو جس دن بھی مسلم لیگ سے الگ کر دیا جاتا اسی دن مسلم لیگ ختم تھی۔ اور مجھے افسوس ہے کہ آج پاکستان بھی دوسرے لفظوں میں ترجمہ ہے محمد علی جناح کا۔ جس دن محمد علی جناح نہ ہو گا اس دن پاکستان کا بھی اشرہی حافظ ہے۔ میں کانپ جانا ہوں جب غور کرتا ہوں کہ پاکستان والوں کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ۷ اگست کو جب قائد اعظم انڈین ڈومینین سے الگ ہو کر راجی تشریف لے گئے تو وہاں مسلم لیگ کی تنظیم ختم ہو گئی تھی۔ شروع سے لیگ کے ہمتی لوگوں میں مختلف مذاق کے لوگ تھے (۱) جو پاکستان

واقعی اعتقاد ادا بیان رکھتے تھے۔ وقلیل ماہم۔ مگر ان کا مسلم لیگ اور اس کی تنظیم پر کوئی اقتدار نہ تھا۔ (۲) جو  
اغراض ذاتی سے مسلم لیگ کے عہدوں پر قابض تھے مگر جو کچھ وہ پاکستان کے لئے کہتے رہے تھے انہیں اپنے ہکے  
کی شرم تھی۔ اس لئے پاکستان کی وجہ سے جو مسلمان قوم پر مظالم ہوئے ان کو خاموشی سے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔  
(۳) جو ان مظالم کو خاموشی سے دیکھ سکتے تھے۔ (۴) جنہیں پاکستان کی حقیقت پر تو کوئی یقین نہیں تھا نہ وہ اسے بگھتے  
تھے۔ مگر محمد علی جناح کے خلوص اور قربانی نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ لیگ کا ساتھ دیں۔ (۵) جو دوسروں کی دیکھا  
دیکھی اس بھڑ میں شریک ہو گئے تھے۔ جو پہلی قسم کے لوگ تھے وہ نو ۱۵ اگست سے پہلے ہی پاکستان کو چل دیتے۔  
دوسری قسم کے حضرات ۱۵ اگست کے بعد سب سے پہلے جلاگے۔ تیسری قسم کے لوگوں میں سے اکثر جلد ہیئے۔ جو بہت  
ہی اکثر تھے وہ رہ گئے۔ چوتھی قسم کے حضرات بھی اکثر دیشتر گرتے پڑتے جلاگے۔ اب انڈین ڈومینین میں تیسری  
اور باہنجوی قسم کے لوگ باقی رہ گئے۔ جو ان کا سیاسی ادارہ معاہدہ تو ختم ہو ہی چکا تھا۔ مسلم لیگ کے نئے فیصلہ  
عہدہ دار اور رورکر پاکستان کو سدھار چکے۔ جو باقی رہ گئے تھے وہ جیلوں میں بند ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ  
کی یہ تاہم شکایتیں ہیں تو کن سے ہیں؟ کیا ان سے جو محض دیکھا دیکھی آپ کی بھڑ میں شریک ہو گئے تھے؟ اگر ان  
سے شکایت ہے تو قطعاً غلط ہے۔ جب لیگ نے میدان خالی چھوڑ دیا تو فوراً انشلٹ مسلمانوں نے  
میدان پر قبضہ کر لیا اور یہ بھڑ ان کے ساتھ ہو گئی۔ چار مہینے کے بعد مسلم لیگ کو تقسیم کیا گیا۔ اگر چار مہینے پہلے  
لیگ کو تقسیم کر دیا جانا تو شاید یہ منظر سامنے نہ آتا۔ اگر قوم کی سیاسی تربیت کی جا چکی ہوتی اور اس کی سیرت  
کی تعمیر کر دی جاتی تب یہ صورت پیش نہ آسکتی تھی اور یقیناً نہ آتی۔ ہندوستان کی سرزمین نے دو لیڈر پیدا  
کئے ایک محمد علی جناح اور دوسرا گاندھی۔ فتح و شکست مقدر کے ہاتھ ہے۔ سیاسی جنگ میں محمد علی جناح جتنا  
اور گاندھی ہار گیا۔ لیکن دونوں کے کاموں کو اگر آپ جانیں گے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ قوم  
صدیوں تک گاندھی کو دعائیں دیگی اور اسے یاد رکھے گی مگر مجھے امید نہیں کہ قوم محمد علی جناح کو زیادہ عرصہ  
تک یاد رکھے سکے۔ کیونکہ دونوں کے کاموں کا فرق ہی یہ ہے کہ گاندھی نے قوم بنائی ہے اور محمد علی جناح  
نے پاکستان بنایا ہے۔ آج گاندھی ہم میں موجود نہیں ہے مگر اس نے کانگریس کو ایسی ہائی کمانڈ عطا کر دی ہے  
جس میں اگرچہ وہ سیاسی بصیرت پیدا نہیں کر سکا مگر قوم اور ملک کی ممت پیدا کر گیا۔ ان سے سیاسی غلطیاں



ہو رہی ہیں اور سخت قسم کی سیاسی غلطیاں ہو رہی ہیں۔ مگر ان غلطیوں میں بھی قوم اور ملک کی محبت کا فرما ہے۔ اس لئے وہ غلطیاں زیادہ نقصان دہ نہیں ہیں۔ لیکن خدا نکرہ اگر کل کو محمد علی جناح ہم میں موجود نہ رہے تو ہمارے پاس ایسی ہائی کمانڈ بھی نہیں ہے جس میں جب قوم یا حب ملک کے جذبات موجود ہوں۔

یہ واقعہ ہے کہ یہ بہت ہی ناگوار اور تلخ حقیقت ہے۔ مگر کتنی ہی ناگوار اور تلخ کیوں نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ حقیقت ہے اور حقیقتیں اکثر تلخ ہی ہوا کرتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں پر جو کچھ گزری ہے یہ قدرت کی طرف سے تازیانہ عجزت ہے پاکستان کے مسلمانوں کے لئے۔ ان کو ہونک مصائب و مشکلات کا شکار اس لئے ہونا پڑا کہ خود ان میں سیاسی بصیرت اور قوم کی محبت موجود نہیں تھی۔ انہوں نے صرف قائد اعظم کی سیاسی بصیرت اور محبت و خلوص کے سہارے پڑھا اور جینا چاہا تھا۔ مگر جب وہ سہارا ان سے چھین لیا گیا تو قوم اسی گڑھے میں گر پڑی جس میں وہ اب تک پلٹی رہی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ پہلے اس گڑھے میں بظاہر عافیت سے بیٹھی تھی اور اب بہت بلندی سے گری۔ اس لئے بہت سے ان میں سے جان سے گئے اور بہت سوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ بہت ہی تھوڑے سے ہیں جو ہاتھ پاؤں سلامت لیکر گرے ہیں۔

مگر واضح رہنا چاہئے کہ یہی وقت پاکستان کے مسلمانوں پر بھی آتا ہے اور ہندوستان کے مسلمان جس بلندی سے گرے ہیں پاکستان کے مسلمان اس سے بھی ڈبل بلندی سے گریں گے۔ ان کے ہاتھ پاؤں تو الگ رہ کر جانوں ہی کے لالچے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ قوم کی سیرت کی تعمیر پر فورا متوجہ ہوا جائے۔

بیرے نزدیک اس وقت اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ قائد اعظم گورنر جنرل بن کر ہماری رہنمائی کریں۔ انہیں گورنر جنرل کے عہدہ سے فوراً استعفیٰ دیکر کانسی ٹیونٹ اسبلی کی صدارت اور مسلم لیگ کی صدارت عظمیٰ پر قناعت فرمائی چاہئے۔ اور جیسا کہ قائد اعظم نے ڈھاکہ وغیرہ میں بار بار فرمایا ہے کہ مسلم لیگ کو پاکستان کے کسٹوڈین کی حیثیت سے کام کرنا چاہئے۔ مسلم لیگ کی صدارت پر رہتے ہوئے قائد اعظم کو پاکستان کے کسٹوڈین کی حیثیت سے پاکستان گورنمنٹ کی رہنمائی کرنا چاہئے۔ گورنر جنرل رہتے ہوئے وہ پاکستان کے لئے ایسے مفید نہیں ہیں جتنے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مفید ہو سکتے ہیں۔ وہ قوم کو یہ نہیں سکھائے کہ غلامی

یہاں جہتے ہوئے قوم کو اپنے حقوق کے لئے کس طرح سینہ سپر ہو کر لڑنا چاہئے تو کم از کم جبکہ انھوں نے خود اپنے کندھوں پر بندوق رکھ کر پاکستان کا ملک فتح کر کے قوم کو دیدیا ہے، اب یہی سکھا دیں کہ جب آزادی حاصل ہو جائے تو اپنی آزادی کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے اور پیش آئندہ مشکلات کو کیونکر حل کیا جاتا ہے۔

قوم ابھی اتنی سید اور ذہین نہیں ہے کہ وہ قائد اعظم کے نمونہ کو دیکھ کر سب کچھ سیکھ جائیگی۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ غلطیاں کرے، گریے، چوٹیں کھائے۔ اور پھر قائد اعظم کی طرف سے اس پر لعنت و ملامت کی بوجھاز ہو۔ نیز انہی غلطیوں کے نتائج کے اس پر چوتے پڑیں تو ممکن ہے کہ قوم کو کچھ نہ کچھ ہوش آجائے اور وہ صورتِ اہبت سیکھ جائے۔

مگر آپ جانتے ہیں کہ جب کام غلط طریقہ سے کیا جاتا ہے تو پھر قدم قدم پر مشکلات ہی پیش آتی ہیں۔ چونکہ ابتداء سے غلط بنیادوں پر کام ہوا ہے یعنی سیرت کی تعمیر جو سب سے پہلے کرنی چاہئے تھی وہ نہیں کی گئی۔ اس لئے میری اس تجویز میں ایک خطرہ ہے اور وہ خطرہ بہت معقول ہے کہ قائد اعظم گورنر جنرل کے عہدہ سے الگ ہو کر یہ عہدہ دیں تو کہے دیں۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ جس شخص کو یہ عہدہ دیا جائے گا کل کو وہ فضل حق، خضریات اور جی ایم سید نہیں بن جائے گا، جو پاکستان کی ہی طاقت اور مشنری کو خود مسلم لیگ کو کھینے کیلئے استعمال نہ کرنے لگے، جیسا کہ خضریات پنجاب میں کر چکے ہیں۔ اس خطرہ کو جب سامنے لانا ہوں تو عقل چکر کمانے لگتی ہے مگر پھر یہی کہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن بالآخر وہ وقت تو آئے گا جبکہ گورنر جنرل کا عہدہ میں کسی دوسرے کو دیتا ہوں گا کیونکہ غلطی کی زندگی تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہو سکی۔ اس لئے یہ عہدہ کسی دوسرے آدمی کے حوالہ ہم ایسے وقت میں کریں جبکہ قائد اعظم کی رہنمائی سے بھی ہم محروم ہو چکے ہوں اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ابھی سے کسی دوسرے کے حوالہ کر دیں۔ کم از کم ہمیں اس کی تعلیم ہی حاصل ہو جائے گی کہ جب کوئی شخص فضل حق یا خضریات بننے لگے تو ہمیں اس کا مقابلہ کیونکر کرنا چاہئے۔

ہم نے اپنے تبصرہ میں واضح کر دیا تھا کہ ہم نے اس بحث کو طے نہیں چھڑا۔ ہم نے لکھا تھا۔

ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جب یہ کچھ لکھا ہے تو اس سے یہ فہم

نہیں کہ پاکستان کے مسلمان قوتِ ایمانی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ یہ وہاں تو

تو یہ بھی کچھ کرتے۔ لیکن اس سے اہل حقیقت تو اپنی جگہ رہتی ہے، یعنی یہ کہ کسی قوم کا نامساعد حالات میں تعلق و مشگلی اختیار کر لینا اور مدد و اہانت پر اترنا اس قوم کی فنا و آدگی کی دلیل ہوتا ہے۔ ہماری اس تنقید سے مقصود ہندوستان کے مسلمانوں کی تنقیح و تحقیر نہیں۔ ان کی تنقیح خود ہماری تنقیح ہے۔ یہ تو ایک دیکھے ہوئے دل کی بکا ہے۔

ہمیں کئی اتفاق ہے کہ وہاں مسلمان قوم نے قومی سیرت کی تعمیر کی کوئی کوشش نہیں کی۔ پاکستان کے مسلمانوں کو جو کچھ ملے وہ ان کی سیرت کی بچگی کا حاصل نہیں بلکہ محض احمقانہ خداوندی ہے۔ صلاحیت و اہلیت کے اعتبار سے مسلمانانِ پاکستان، مسلمانانِ ہندوستان سے کچھ بہتر نہیں لیکن ان دونوں میں جو بہت بڑا فرق ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان کے مسلمانوں کے پاس ایک ایسا قطعہ ارض ہے جہاں پر اس چیز کا امکان ہے کہ وہ اپنے سیرت و کردار کی تعمیر کر سکیں اور ان خصائص کو برقرار رکھ سکیں جو خیر امت ہونے کی حیثیت سے انھیں دوسری اقوام سے میسر کرتی ہیں۔ اس کے برعکس، اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں تزلزلہ ایمان اور ضعفِ خودی پیدا ہو گیا تو دس سال بعد اس خطہ میں بیرونی سیاح کو ڈھونڈنا پڑے گا کہ مسلمان کہاں ہے۔ اسی لئے ہم نے لکھا تھا کہ نامساعد حالات میں حق گوئی و بے باکی ہی قوتِ ایمانی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت ترابلیس سے واسطہ پڑا ہے لہذا ان کی خودی کہیں زیادہ مستحکم ہونی چاہئے۔ ان کے لئے کہیں زیادہ جوش و خروش قوتِ ایمانی اور استحکامِ خودی کی ضرورت ہے۔ ہم پھر دہراتے ہیں کہ ہم مسلمانانِ پاکستان کو اپنی تنقید سے مستغنی نہیں سمجھتے اور مسلمانانِ ہندوستان کی تنقیح کو ہم اپنی تنقیح سمجھتے ہیں۔ البتہ ہم نے جس ریلے کا اظہار کیا ہے اور جس سے ہمارے کرم فرمائے اس قدر اختلاف کا اظہار کیا ہے ہم اس پر اب بھی قائم ہیں۔

# اقبال اکادمی

ہم وزیر اعلیٰ کی تجویز متعلقہ اقبال اکادمی کا غیر مقدم اور اس پر قبضہ گذشتہ اشاعتوں میں کر چکے ہیں۔ اکادمی کے قیام و لائحہ عمل سے متعلق گزارشات پریس میں جا چکی تھیں کہ ہمیں مجلس مرکزیہ یوم اقبال لاہور کی مندرجہ ذیل قرارداد موصول ہوئی :-

مجلس مرکزیہ یوم اقبال مسجد شاہ چراغ لاہور کے اجلاس منعقدہ ۱۵ مارچ میں موصوفہ ذیل قرارداد با اتفاق رائے منظور ہوئی۔

مجلس مرکزیہ یوم اقبال کا یہ اجلاس حکومت پاکستان کے اقبال اکادمی کے قیام کی تجویز اور اس کے لئے اسی سال کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے کی منظوری کو ایک ستم اقدام خیال کرتا ہے اور اس کی رائے ہے کہ یہ اقدام پاکستان کے باہمی اولیٰ کی مناسب یا ہر گز کے قیام کا صحیح اقدام اسی صورت میں سمجھا جائیگا جب داعی علیہ الرحمۃ کے اپنے تصور کے مطابق اسے علی جامعہ پٹنہ یا جامعہ حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی تجویز یعنی کہ ملت کی صحیح نشاۃ الثانیہ کے لئے از بس ضروری ہے کہ ایک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جس میں قدیم اسلامی علوم و فنون کی وہ تمام کتب جمع کی جائیں جو اگرچہ نادر الوجود ہیں لیکن مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں ابھی تک باقی ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے کتب خانہ میں مجدد حاضر کی بھی تمام اہم علمی و فنی کتب جمع کی جائیں۔ ساتھ ہی انسٹی ٹیوٹ میں صحیح استعداد و قابلیت کے محققین مقرر کئے جائیں جن کی تحقیق کی غرض و قیامت دو مقاصد کی حامل ہو۔ اول تحقیق کی جائے کہ کس حد تک مغربی علوم و فنون کے اخذ اسلامی محققین و مصنفین کی وہ تصانیف ہیں جن کو اگرچہ مسلمان کھو چکے ہیں لیکن وہ اب تک یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں اور ان کے مستشرقین کے قبضہ میں ہیں۔ دوم یہ کہ مجدد حاضر کے

علیٰ دینی ارتقا سے استفادہ کا وہ طریق عمل میں لایا جائے جس سے ملتِ اسلامیہ کا مستقبل مزہبِ حقِ اسلام کے صحیح ارتقا کے عین مطابق ہونے کا اس کے خلاف یا اس کے متصادم۔ اسی مقصد و حید کو مد نظر رکھ کر علامہ علیہ الرحمۃ نے پانچواں کتب خانہ ملتِ اسلامیہ کے لئے وقف کیا اور اس وقف کا مقصد یہ قرار دیا کہ اس کتب خانہ کو مجوزہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا مرکز قرار دیا جائے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد اس کتب خانہ کو ان کی وصیت کے مطابق اسلامیہ کالج لاہور کو منتقل کیا گیا۔ بنا برہی یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ

(۱) مجوزہ اقبال اکادمی لاہور میں قائم کی جائے۔

(۲) اکادمی کی غرض و غایت وہی ہو جو علامہ علیہ الرحمۃ کی غرض و غایت اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں تھی۔

(۳) اس غرض کے صحیح حصول کی ایک صورت یہ ہے کہ لندن میں انڈیا آفس لائبریری کی جو تقسیم اس وقت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان عمل میں آئے والی ہے اس کے نتیجے کے طور پر لائبریری منگوانی جو کہ پاکستان کے حصہ میں آئیں ان کو اقبال اکادمی کی تحویل میں دیدیا جائے۔

(۴) اقبال اکادمی کے لاہور میں قیام کی صورت میں اکادمی کا جائے وقوعہ پنجاب پبلک لائبریری کی عمارت ہو۔ جس کو آئندہ پبلک لائبریری کہنے کی ضرورت نہیں اس کی موجودہ عمارت اور موجودہ کتب خانہ کو اقبال اکادمی کا بنیاد بنا دیا جائے۔ بالفاظِ دیگر علامہ علیہ الرحمۃ کا اپنا وقف کردہ کتب خانہ موجودہ پبلک لائبریری لاہور اور انڈیا آفس پاکستان کے حصہ میں آیا ہوا تمام کتب خانہ اقبال اکادمی کے جامع نام سے موسوم کیا جائے اور اس میں علوم و فنون کے محققین کا تقرر جلد سے جلد عمل میں لایا جائے۔

ہم اس قرارداد کی تائید کرتے ہیں۔ لاہور کی فضا بہر کیفیت زیادہ علمی ہے۔ لہذا اکادمی کے لئے بمبئی ہمارے خیال میں بہ معاملہ ایک سب کمیٹی کے سپرد کرنا چاہئے جو تشکیل اکادمی کے ضمن میں دیگر تہیدی امور کے علاوہ اس کا بھی فیصلہ کرے گا اکادمی کا مرکز کہاں ہو۔ یہ انتخاب شدیداً اقبال کے صلح و مشورہ سے ہی طے ہونا چاہئے۔

# مسلم لیگ کی تنظیم نو

لیگ کے ایک سابق کارکن کے تاثرات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

طلوع اسلام کی اشاعت مارچ (۱۹۴۷ء) میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کے اس فیصلہ پر اظہارِ خوشنودی کیا جا چکا ہے جس کے مطابق مسلمانوں کی اس قومی تنظیم کو سرکاری اتر و نفوذ سے آزاد کر کے، اس کی تسلیم نو کا اعلان کیا گیا ہے۔ چوہدری ظفر علی خان کو لیگ کونسل نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ نئے دستور کے مطابق مملکت پاکستان میں لیگ کی تنظیم کریں۔ چوہدری صاحب نے اس سلسلہ میں جو نظام عمل پیش کیا ہے اس کے مطابق تنظیم جدید کا کام قریباً چار ماہ میں ختم ہوگا۔ ابتدائی ارکان کی بھرتی فی الفور شروع کر دی گئی ہے جو ۲۱ اپریل تک ختم ہوگی۔ ۷ مئی تک ابتدائی لیگوں کے انتخابات مکمل ہوں گے۔ ضلع اور شہری لیگوں کے انتخابات کی تکمیل ۷ جون تک ہوگی۔ پاکستان لیگ کونسل کے صوبائی نمائندوں کے انتخاب اور دوسرے ضروری امور کے لئے صوبہ لیگوں کے اجلاس ۲۱ جون تک ختم ہوں گے۔ چوہدری صاحب کو امید ہے کہ نئی کونسل جولائی کے پہلے ہفتہ تک مکمل ہو جائے گی۔

جس وقت زیر نظر شمارہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا پہلا مرحلہ (ابتدائی ارکان کی بھرتی) ختم ہو چکا ہوگا اور بقیہ مراحل کو طے کرنے کی تیاریوں کا آغاز ہو رہا ہوگا۔ حصول پاکستان کے بعد لیگ کی حیثیت میں بنیادی تبدیلی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مارچ کے پرچہ میں لکھا جا چکا ہے، اب تک لیگ کی

۱۰ ہفتہ میں اس پرہ گرام میں ایک ماہ کی توسیع کر دی گئی ہے۔

حیثیت ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک فرقیہ ستھام سے زیادہ کچھ نہ تھی، لیکن اب مسلم کی حیثیت یہ ہوگی کہ وہ حکومت کے عزائم و اعمال پر محتبانہ نگاہ رکھے اور اس امر کا جائزہ لیتی رہے کہ حکومت پاکستان کا قدم جاہد حق و صداقت سے ہٹنے نہ پائے۔

اس اعتبار سے لیگ کا دورِ جدید اس کے دورِ گذشتہ سے سراسر مختلف ہوگا۔ لہذا اس کی تنظیم نو میں اس کی موجودہ اہمیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اب غیر معمولی خرم و احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ کارکنوں اور عہدیداروں کے انتخاب کے سابقہ معیار بدلنے پڑیں گے۔ الغرض لیگ کی تنظیم پوری سنجیدگی اور دبا ستداری سے کرنا ہوگی۔ ان سطحوں کے راقم کو پنجاب میں، لیگ کے دورِ گذشتہ میں اس کے ایک ادنیٰ اقدام کی حیثیت سے کام کرنے کا بہت موقع ملا ہے۔ سات سال کے ذاتی تجربہ کی بنا پر جو اس عرصہ میں شریک سوز سماز مجبور ہو کر حاصل ہوا، تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لیگ کسی وقت بھی صحیح معنوں میں ایک تنظیم نہیں بن سکی۔ لیگ نے ہنگاموں اور نعروں سے، جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے، آتش باز تقریروں اور شعلہ فشاں بیانون سے اپنے مقصد کو پایا۔ اور اتنے قلیل عرصہ میں کہ خوار باب لیگ اُس کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جس حد تک جماعتی تنظیم کا تعلق ہے وہ کسی وقت بھی پیدا نہیں ہو سکی۔ مقامی طور پر کئی جگہوں پر اچھے اچھے کارکن موجود تھے جو مخلصانہ اور گر مجوشانہ کام کرتے تھے لیکن ان کی سرگرمیوں میں کوئی ربط نہیں ہوتا تھا۔ اس ربط کے فقدان کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایسے کارکنان کو تو بہت زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور دیگر کارکن لیگ بالکل بے کار و معطل رہتے تھے۔ کسی جماعت کے پاس کوئی نظام عمل نہ تھا۔ ایک ابتدائی لیگ اپنی ہمسایہ ابتدائی لیگ کی سرگرمیوں سے بے خبر تھی۔ ضلع لیگ کو اپنی شاخوں کا کچھ علم نہ تھا۔ شہری لیگ کو اپنی حدود کا پتہ نہیں تھا اور صوبائی لیگ کے پاس کوئی مستند ریکارڈ نہیں تھا کہ اس کے ماتحت کتنی جماعتیں ہیں، ان کے عہدیدار کون کون سے ہیں اور ان کے ارکان کی تعداد کتنی ہے۔ ہر سال لیگوں کے نام نہاد انتخابات بھی ہوتے رہے لیکن ان کی حیثیت بھی عام طور پر ایک فریب سے زیادہ کچھ نہ ہوتی تھی۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر صوبائی جماعتوں کے انتخابات تک، کوئی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ چنانچہ لوگ ایک دفعہ لیگ کی جماعت پر چھا گئے، ان کا تسلط آختر تک بفرار رہا۔ اس کے بعد اچھے کارکنوں کو تنظیم لیگ میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل

نہ ہو سکی اور بہت کم جماعتیں آخر تک اپنے حلقوں کی صحیح نمائندہ رہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ابتدائی جماعتوں کا عوام سے، مختلف جماعتوں کا ایک دوسری سے، ابتدائی جماعتوں کا ضلع لیگ سے اور ضلع لیگ کا صوبائی لیگ سے کوئی ربا نہیں ہوتا تھا۔ اس عدم ارتباط کے علاوہ، ہر جماعت۔ ادنیٰ و اعلیٰ۔ کی اندرونی تنظیم ناپید تھی، بلکہ اس عمارت کی خشک اول ہی غلط رکھی جاتی تھی۔ پنجاب مسلم لیگ کے آئین میں ابتدائی لیگ کے ارکان کی کم سے کم تعداد پچاس رکھی گئی تھی۔ اس کے مطابق اگر کسی ایک گاؤں میں ارکان کی تعداد پچاس سے کم ہو تو اسے نواحی گاؤں سے ناکار ایک وحدت بنا دینے کی اجازت تھی تاکہ اس وحدت کے ارکان کی تعداد کم از کم پچاس ہو جائے لیکن عملاً اس شرط کو بہت کم پورا کیا جاتا تھا۔ ہونا یہ رہا ہے کہ اگر ایک گاؤں میں ایک شخص کو کام کرنے کا شوق ہوا تو اس نے ایک برائے نام صدر نائب صدر اور دیگر عہدیدار بنا کر اور خود سیکرٹری کے فرائض نبھال کر جماعت کی تشکیل کھوی۔ یہ دیکھنے کی کبھی بھی کوشش نہ کی گئی کہ اس کے ابتدائی ارکان کی تعداد پچاس ہو سکتی ہے یا نہیں۔ دوسری طرف یہ ہوتا رہا کہ کئی بڑے قصبہ میں کوئی ابتدائی جماعت ہی نہ تھی، اس لئے کہ وہاں کوئی اس قسم کا "ایک شخص" موجود نہ تھا۔ جن نام نہاد ابتدائی جماعتوں کی تشکیل بھی ہوئی ان کے دائرہ عمل میں بہت کم عام ارکان کی بھرتی کی ضرورت محسوس کی گئی اور لطیفہ یہ ہے کہ خود عہدیداروں میں سے بیشتر حضرات لیگ کے باضابطہ رکن نہیں ہوتے تھے۔ آج بھی اگر رکنیت کی پڑتال کی جائے تو لیگ کے کئی ممتاز قائدین اور صوبائی مجالس متفننہ کے وہ خوش قسمت لیگی ارکان جو کئی مخلص اور دیرینہ خادمان لیگ کا حق غضب کر کے لیگ کے ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، کسی ابتدائی جماعت کے رکن نہیں بن سکیں گے۔

ان نام نہاد ابتدائی لیگوں کی سرگرمیاں صرف اس حد تک محدود تھیں کہ ان کے عہدیداروں کے نام وقتاً فوقتاً چھپ جایا کریں۔ انھیں بہت کم کام کرنے کا سلیقہ تھا اور اوپر سے انھیں کسی قسم کی راہنمائی یا سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اس ابتدائی لیگ کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کی بالا جماعت (Parent body) کون سی ہے۔ پنجاب لیگ کے آئین میں وحدت (Unit) ابتدائی لیگ تھی اور اس کے اوپر دوسرے درجہ پر ضلع لیگ تھی۔ لیگ کے آئین میں تحصیل لیگ کا ذکر نہیں تھا، جس کی وجہ سے ابتدائی لیگوں کو ضلع



رہا قائم رکھنے میں بہت دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ طبعی مشکلات کے علاوہ، شہری اور دیہاتی مزاج کا بعد تھا جو ماتحت شاخ اور ضلع لیگ میں خلا رہن کر حائل ہوتا تھا۔ کسی معاملات پر تحصیل کے صدر مقام کی لیگوں نے اپنے آپ کو ابتدائی شاخوں کا حاکم سمجھنا شروع کر دیا۔ گذشتہ صوبائی مجالس مقننہ کے انتخابات میں، پنجاب صوبائی لیگ نے اس کمی کو خود محسوس کیا اور ہنگامی طور پر ابتدائی لیگ اور ضلع لیگ کے درمیان تحصیل لیگ کو تسلیم کر لیا۔ یہ وقتی اقدام صرف ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تھا اور انتخابات ختم ہو جانے کے بعد اس ضرورت کا احساس کوئی مزید عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ عارضی طور پر تحصیل لیگ کے وجود کو تسلیم کر لینے میں ایک قباحت یہ پیدا ہوئی کہ جس جماعت کو تحصیل لیگ کا نام دیا گیا وہ تحصیل کے صدر مقام کی لیگ تھی اور اپنے حلقہ کی بھی پوری نمائندہ تھی۔ جب دیہات کی لیگوں نے تحصیل کے صدر مقام کی لیگ سے ربط پیدا کیا تو انہیں بگاڑت اور اجنبیت سی محسوس ہوئی۔ چنانچہ کئی ایک تحصیل لیگوں میں یہ مطالبہ کافی تقویت پزیر گیا کہ ان کے نئے انتخابات کرائے جائیں، کیونکہ یہ اپنی تحصیل کے حلقوں کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتی تھیں۔ چونکہ مجالس مقننہ کے انتخابات کے پیش نظر لیگ کے انتخابات ملتوی ہو چکے تھے، اس لئے تحصیل لیگ اور ابتدائی لیگوں میں غیریت باقی رہی۔

اس نام نہاد تحصیل لیگ کے پاس اپنی شاخوں اور ان کی سرگرمیوں کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا بلکہ بیشتر تحصیل لیگوں کے پاس سرے سے دفتر ہی نہیں تھا۔ دفتر کی عدم موجودگی میں عوام کو اپنی نمائندہ جماعت سے ربط پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس جماعت کے پاس نہ کارروائی کا ریکارڈ تھا نہ ارکان کی فہرست، چندہ کا حساب رکھنے کی تو ضرورت ہی بہت کم محسوس کی جاتی تھی، کیونکہ بقول شخصے حساب رکھنا بیوں کا کام ہے۔ حساب کتاب کی بے قاعدگی سے وہ حد شروع ہوتی ہے جہاں سے عوام کا اعتماد متزلزل ہونا شروع ہوتا ہے۔ قومی جماعتوں کی بدنامی اور ناکامی کا بیشتر سبب یہی بے ضابطگی ہوتا رہا ہے۔ اس بے ضابطگی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جماعتوں نے دفتر رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی یا وہ دفتر کھولنے کا اہتمام نہیں کر سکیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دفتر کے بغیر حساب کتاب کی باقاعدگی مشکل ہے۔ دوسری وجہ اس بے ضابطگی کی یہ ہے کہ ضلع یا صوبہ کی طرف سے کوئی محاسبہ نہیں تھا۔ ضلع کی تنظیم

ہاگل پیچھے پھینک دیا گیا۔ چنانچہ پنجاب لیگ نے اپنے زیر اہتمام جس قدر سچی کارکنوں کے اجتماعات کئے، ان میں انہی لوگوں کو شریک کیا، جنہیں کام کرنے کے بہت کم مواقع ملے ہیں۔ شہروں میں لیگیں عموماً مسطل ہوتی ہیں۔ ان کا کام صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ کسی لیڈر کی آمد پر کسی پبلک جگہ پر، ایک جلسہ عام کا انعقاد کر دیں۔ اس کے بعد کام خبر رساں لجنہوں کا رہ جانا ہے، جو اس جلسہ کی روئداد نشر کرتی ہیں اور دنیا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں لیگ اتنا کام کر رہی ہے۔ شہری لیگوں کو کام کے لئے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوتی ہیں، جو دیہات میں یکسر ناپید ہوتی ہیں۔ اس لئے لیگ کی حقیقی خدمت کا مزہ کچھ انہیں لوگوں کو آیا ہے جنہیں دیہات کے دشوار گزار راستوں پر موسمی حوادث کے شدائد کا مقابلہ اور اپنی طبعی ضروریات کو قسربان کرتے ہوئے، اجڈ اور اکھڑ عوام میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ضلع اور صوبہ کے عمائدین کی نظر میں یہ کام اس لئے کام نہیں تھا کہ اس کا چچا اخبارات میں نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ انتخابات عمومی کے بعد، پنجاب مسلم لیگ نے لیگ کی تنظیم میں نئی روح پھونکنے کے لئے کارکنوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ راقم الحروف نے اپنی بے بضاعتی کے باوجود دفتر صوبہ لیگ کو لکھا کہ اسے بھی، اس اجتماع میں شرکت کی اجازت دی جائے تاکہ دیہات میں کام کرنے والوں کی ضروریات و مقتضیات کو بھی پیش کیا جاسکے۔ راقم، صوبہ لیگ سے سفر خرچ کا خواہش مند نہیں تھا۔ لیگ کے جدیدہ میں روح پھونکنے کے متعلق، اپنے تجربات کی روشنی میں چند تجاویز پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کہ صوبہ لیگ میں پنجاب کے بہترین اہل دماغ موجود تھے، لیکن کبھی کو دکھ ناداں، بھی خرد مندوں کو خورد کی بات سمجھا سکتا ہے۔ دفتر صوبہ لیگ نے، نہایت حقارت سے، اس پیشکش کو ٹھکرادیا اور جواب دیا کہ اس اجتماع میں شہری کارکنوں کے سوا کسی کو شرکت کی اجازت نہیں۔ اس کانفرنس میں کیا قابل عمل تجاویز طے ہوئیں اور لیگ کی تنظیم جدیدہ کے لئے کیا عملی کارروائی کی گئی؟ اس کا جواب اس سکوت مرگ سے دریافت کیجئے، جو اس کانفرنس کے بعد پنجاب کی لیگ پر طاری ہوا۔

یہ ایک انفرادی واقعہ نہیں بلکہ یہ عکس ہے اس عام مایوسی اور بددلی کا، جو لیگ کے بے غرض خادموں کو بار بار اپنی جماعت اور جماعت کے قائدین کے ہاتھوں ہوئی۔

منع کے اوپر صوبہ لیگ بھی اسی طوائف الملوکی کا مظہر تھا۔ چونکہ اس دیوار کی بنیاری اینٹ ہی غلط رکھی جاتی تھی، اس لئے اوپر تک اس کا کج چلا جانا موجب حیرت نہیں تھا۔ درمیان کی کڑیوں کے منتشر ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صوبہ لیگ کے قائدین اور عوام المسلمین میں قطبین کا بُعد ہو جانا تھا اور دونوں میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی تھی۔ عوام نے اس بُعد کے باوجود اپنے فرض کو کما حقہ، سرانجام دیا، لیکن انھیں یہ احساس مضطرب کئے بغیر نہ رکھ سکتا تھا کہ ان کے لیڈر ان میں سے نہیں ہیں۔ وہ ان لیڈروں کے گلوں میں پھولوں کے ہار بھی ڈالتے تھے، انھیں زندہ باد بھی کہتے تھے اور پوری عقیدت سے ان کی تقاریر بھی سنتے تھے لیکن وہ، زیر لب، یہ نیاز مندا نگہ بھی کرتے تھے کہ ان کے لیڈروں نے کبھی ان سے گلے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ اور ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا، کیوں کہ دونوں کے مزاجوں میں بدیہی تضاد و تباہی تھا۔ وہ جلسہ ہائے عام میں قوم کے درد سے بے قرار نظر آتے تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں اپنے اس کارنامہ پر فخر کیا کرتے تھے کہ لیگ نے مسلمانوں کو ایک قوم بنا دیا ہے، لیکن انھوں نے، کسی وقت بھی، اپنی بلندیوں سے اتر کر اس قوم کو خود دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کبھی اپنی قوم کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ لیگ کے بیشتر فیصلے قوم کے لئے نہ صرف باعث حیرت، بلکہ پریشان کن ہوتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو طبائع کا یہ تضاد تھا، جو دونوں۔ قائدین اور بیروکاروں۔ کو ایک دوسرے کے قریب تر ہونے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مانع تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اخلاقی جامعوں کی طرح صوبائی لیگ بھی ایک محدودے طبقہ کا اجارہ تھی۔ ایک شخص، جو ایک دفعہ اپنی دنیاوی وجاہت کے بل بوتے پر صوبہ لیگ تک پہنچ جاتا تھا، مستقلاً مسلط ہو جاتا تھا۔ اس سے مرکز پر اس طبقہ کا مستقل اجارہ قائم ہو جاتا تھا۔ صوبہ پنجاب لیگ کی کمان عالیہ کو دیکھئے **بِسْمِ اللّٰہِ** کے بعد جب سے پنجاب لیگ یونیٹ آمیزش سے پاک ہوئی ہے، ایک ہی گروہ لیگ ہائی کمانڈر چھاپا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد صوبہ لیگ نے مختلف مقاصد کے لئے جو مختلف ذیلی مجالس وغیرہ تشکیل کیں، ان میں بھی یہی لوگ نظر آتے ہیں۔ صوبائی لیگ کی مجلسِ عاملہ، پارلیمانی بورڈ، مجلسِ عمل، پارلیمانی پارٹی اور دوسری ہر ذیلی مجلس میں ایک ہی گروہ ہے، جو مختلف رنگ بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔ اگر آپ پارلیمانی بورڈ کا لیبل اتار کر اس پر مجلسِ عمل کا لیبل لگا دیں

تو آپ مطلق یہ محسوس نہ کریں گے کہ آپ کے ہاں مجلس عمل موجود نہیں ہے۔ ایک ہی شخص ایک وقت میں مختلف النوع فرائض سرانجام دے رہا ہے؛ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کام بھی مکمل نہیں ہو رہا۔ اس اجارہ داری (Monopoly) نے جہاں دوسرے کارکنوں کو اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع سے محروم رکھا ہے وہاں لیگ کو اغراض کی جنگ کا اکھاڑہ بنا دیا ہے۔ یہ بظاہر ایک الزام معلوم ہو گا، لیکن اگر آپ صوبائی مقننہ کے انتخابات کے دوران میں لیگ ٹکٹ کی تقسیم کا منظر سامنے لائیں تو آپ پر اس الزام کی حقیقت کھل جائے گی۔ اس کی حد یہ ہوئی کہ وزارتی مناصب کی تقسیم کے وقت بھی یہی لوگ پیش پیش نظر آئے اور ان مناصب کے حصول کے لئے بے چاری قوم کو حسب معمول فراموش کر دیا گیا۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ لاکھوں بے گناہ مسلمان سوت کا شکار ہو رہے تھے اور بے تابانہ اپنے اُن نامبندوں کی تلاش کر رہے تھے جنہیں انہوں نے وڈٹ دیئے تھے، یہ نمائندے اپنے مرکزوں کو چھوڑ کر لاہور کے درو دیوار کو اپنی کاروں کی گروسے آلود کر رہے تھے تاکہ صوبہ کی وزارت کوئی دوسرا چھین کر نہ لے جائے۔

مقننہ کے انتخاب کے لئے لیگ ٹکٹ کی تقسیم کے متعلق توقع یہ کی جاتی تھی کہ پارلیمانی بورڈ مختلف امیدواروں کی قابلیت، بے غرضی اور سابقہ خدمات کو پیش نظر رکھ کر انتخاب کرے گا اور جہاں اُسے اس انتخاب میں دقت پیش آئی، وہاں ماتحت اضلاع اور دیگر جماعتوں سے مشورہ کر لیا جائے گا۔ یہ توقع عین فطری تھی، کیونکہ صوبائی قائدین ہر امیدوار کے متعلق ذاتی معلومات نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں مقامی جماعتیں ہی بہتر مشورہ دے سکتی تھیں۔ لیکن پارلیمانی بورڈ نے اپنی کسی ماتحت جماعت سے مشورہ لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور بالابالا چند ایسے آدمیوں کو ٹکٹ دیدیئے، جن کی ساری عمر لیگ کے مقاصد کی خلاف ورزی کرتے گزری تھی، جو بدترین قسم کے کارہائیں اور حکام پرست تھے، جو تعلیم کے اعتبار سے صفر تھے۔ لیکن جن کی سب سے بڑی۔ اور ایک ہی۔ خوبی یہ تھی کہ وہ کسی بڑے لیڈر کے منظور نظر تھے۔ ممکن ہے صوبائی پارلیمانی بورڈ کو یہ خدشہ ہو کہ مقامی جماعتوں کے مشورے جا بندار نہ ہوں گے۔ لیکن اس خدشہ کو وہ یوں رفع کر سکتے تھے کہ ہر حلقہ میں خود جا کر، وہاں کے رائے دہندگان کا عندیہ معلوم کرتے اور مقامی جماعت کے مشورے کے ساتھ اپنے جائزے کا موازنہ کر کے، فیصلہ دیتے۔ لیکن اس میں

صوبائی قائدین کا کچھ تصور نہ تھا۔ لیگ کی تنظیم کی یہ دیوار، جو خستہ کج پرکھی گئی تھی، اوپر تک ٹیڑھی جا رہی تھی۔ باہمی ربط اور پرکھ منقود تھا۔

ابتدائی لیگوں سے صوبہ لیگ تک باہمی ربط کی یہ کیفیت تھی۔ اب اس سلسلہ کی آخری کڑی — صوبائی دفتر — کو لیجئے۔ صوبہ پنجاب لیگ کے دفتر کی عمارت ٹرائین کے لئے خاصی جاذب تھی لیکن دفتری نظام سرے سے غائب تھا۔ دفتر میں دیدہ زیب فرنیچر بھی موجود تھا اور بڑی بڑی تنخواہوں والا اعلیٰ بھی لیکن اس کی دفتری کیفیت لیگ کے دوسرے تنظیمی پہلوؤں سے کہیں زیادہ مایوس کن تھی۔ ہمیں بارہا صوبہ لیگ کو مراسلات لکھنے کا اتفاق ہوا، لیکن ایک آدھ کے سوا کسی خطا کی رسید تک بھی موصول نہ ہوئی۔ ماتحت شاخیں عجیب الجھن میں تھیں۔ وہ ضلع لیگ سے مشورہ نہیں لے سکتی تھیں، کیونکہ ضلع میں لیگ ہی نہ تھی اور صوبہ لیگ کے نازک مزاج ناپ سمن نہیں رکھتے تھے۔ انتخابات عمومی کے دوران میں صوبہ لیگ کے دفتر کو کچھ منظم کیا گیا۔ لیکن انتخابات کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس عارضی تنظیم کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ انتخابات میں کئی کمزور حلقوں کو مللی امداد دی گئی تھی۔ صوبہ لیگ کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اس نے اس کے بعد آج تک، حساب کتاب کی پڑتال کرنا تو درکنار اتنا بھی دریافت نہ کیا کہ انتخاباتی مہم پر کس قدر خرچ کیا گیا ہے۔

تنظیم کی اس تصویر کو ہم نہیں پر ختم کرتے ہیں۔ اس کے اوپر مرکزی لیگ کو ہم غما نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اسی خاکے سے لگایا جاسکتا ہے، جو سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تھی وہ لیگ، جو مسلمانوں کے افکار و آراء کی ترجمان، ان کی ملی آرزوؤں کی آئینہ دار اور ان کی واحد نمایندہ جماعت تھی اور یہ تھی اُس لیگ کی تنظیم جس کے بل بوتے پر ہم دنیا کی سب سے بڑی ملوکیٹی طاقت — برطانیہ اور دنیا کی ایک بہت بڑی سرمایہ دار اور منظم قوم — ہندو سے ٹکر لے رہے تھے۔ ہم نے اپنے مقصد کو پایا۔ تنظیم کے اس فقدان کے باوجود ہم کو پاکستان حاصل ہو گیا۔ یہاں تک ہم نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ لیکن اس کے بعد —

اس کے بعد آج جب اس انعامِ عظیم کی امانت کو سنبھالنے کا وقت آتا ہے تو ہمیں بالعموم ہر طرف شکایت ہی شکایت نظر آتی ہے جو للچائی ہوئی نگاہوں سے اس امانت کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم نے اپنی دس سالہ جدوجہد میں کوئی بھی گروہ ایسا نہیں پیدا کیا جو خائن نہ ہو اور جو پاکستان کا صحیح امین

بن سکے؟ گذشتہ دس سال میں لیگ کے سینکڑوں قائدین منظر عام پر آئے۔ انہوں نے قوم سے داد و تحسین حاصل کی۔ ان کے ناموں کے چرچے ہوئے۔ یہ کیا قیامت ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بھی آج پاکستان کو سنبھالنے کے اہل نظر نہیں آتے؟ ایسا کیوں ہے؟ یا ایک ایسی داستان ہے جو تلخ حقیقتوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیا ان حقیقتوں کو اس نے پوشیدہ رکھا جائے کہ یہ تلخ ہیں؟ مگر تمہارے اور اس داستان کو سن لیجئے۔ اس میں عبرت و موعظت کے جواہر پنہاں ہیں۔

ان تلخ حقائق کو پیش کرنے سے مقصود اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی تشریح نہیں نہ کسی کی تنقید و تخریر بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اب جبکہ بدلے ہوئے حالات میں ہم مسلم لیگ کی تنظیم نو کر رہے ہیں، ہم سابقہ غلطیوں کا اعلاہ ذکر کریں اور لیگ کو ایک مخصوص اور محدود طبقہ کا اجارہ بنا دینے کی بجائے صحیح معنوں میں علوم کی ترجمان بنائیں۔

۱۹۵۷ء کے بعد ۱۹۶۱-۶۲ء میں براعظم ہند سے بیرونی اقتدار کو ختم کر دینے کی ایک بہت بڑی کوشش کی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آزادی کا تصور بھی اقدام بغاوت سے کم نہیں تھا۔ باشندگان ہند کے فطری جذبہ حریت کو چند ہنگامی واقعات نے تیز کر دیا۔ اس دور کی جنگ آزادی جو کہ نہ دفرسودہ نظام وقت کے خلاف ایک عام بغاوت تھی، ایک بہت بڑی جرات تھی۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے، اس وقت آزادی کا تصور بھی بغاوت سے کم نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آزادی کا نام لینے والوں کے ساتھ دس فہرے کے بد معاشوں سے بھی زیادہ ذلیل سلوک کیا جاتا تھا۔ جیلوں میں سیاسی قیدیوں کو علیحدہ سہولتوں یا امتیازی سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انہیں عام اخلاقی قیدی تصور کیا جاتا تھا اور کسی سیاسی قیدی کو خواہ وہ اپنے مجلسی درجہ اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اسے یا بی یا اسپیشل کلاس کی نعمتوں سے متنع نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ مولانا محمد علی مرحوم ایسے مسلم الثبوت راہنما بھی جیلوں میں چکی پسا کرتے تھے، کنوؤں میں جھنڈے تھے اور پنے اور بالک کے ڈنٹھل کھایا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آزادی کا نام لینے پر لوگوں کو شاہراہ عام پر ہنگامی سے باز رکھنا آزادی کے لگانے جاتے تھے اور انہیں پیٹ کے بل رینگنے کا انصافیت سوز حکم دیا جاتا تھا۔ محض شبہ پر جانداروں منبٹ کر لی جاتی تھیں۔ روڑکے کے گناہ پر باپ کی پیش بند

کر دی جاتی تھی۔ حکومت کی اس تشدد و انداز ذلیل کارروائی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہی لوگ میدان میں اترنے کی جرأت کر سکتے تھے جو ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کو تیار تھے۔ جو سب کچھ ٹاڈینے پر بھی اپنے ہاں کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ جن کے سر میں حقیقی انقلاب کا سودا اور دل میں حریت کا جوش تھا۔ یہ طبقہ بالعموم غریبوں کا طبقہ تھا جو لوگ بڑی بڑی جینٹوں کے مالک تھے وہ سیاسی سرگرمیوں سے نہ صرف الگ رہے بلکہ انہوں نے غیر ملکی حکومت کے اجیروں کی حیثیت سے تحریک آزادی کو ناکام کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ قوت فرعون کے ان مریدوں نے انقلاب زندہ باد کے نعروں کا اثر زائل کرنے کے لئے امن بسھائیں بنائیں تاکہ لوگوں کو امن و سکون دینی سکوت و وجود کی تلقین کی جاسکے۔ تحریک عدم تعاون میں بھی لوگ تھے جو حکومت کی انتظامی مشینری کے کل بڑے بن کر دوا اعلیٰ میں قبولیت کا مقام بلند حاصل کر رہے تھے۔ یہ لوگ بالطبع جمود پسند تھے۔ وہ ہر تفریق کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ سیاسی تحریک سے ان کی علیحدگی اس مقصد کے پیش نظر تھی کہ ان کے مراتب و مدارج سرکاری عتاب سے محفوظ رہیں اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر انہوں نے ہر وہ حرکت کی جو حکام کو خوش کرنے کے لئے کی جاسکتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اپنی اُس قوم سے غداری کے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا جو اُس وقت کے نظام کو الٹ دینے کے ورہے تھی۔

اس طرح غریبوں اور امیروں میں ایک بہت بڑی خلیج حاصل ہو گئی۔ غریب جیلوں میں تھے یا پولیس اور فوج کی لاشی اور گولی کا شکار۔ اور امیروں کے مضائب پر اپنی ذہنی برتری کے قصر تعمیر کر رہے تھے۔ قدرتی طور پر ان حکام پرستوں کا یہ یسوں اور غداروں (یا اس وقت کے مزدوروں ترین خطاب کے مطابق ٹوڈیوں) کی حیثیت اپنی قوم میں اچھوتوں کی سی رہ گئی۔ معاشرے میں وہ سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی قدر و منزلت صرف حکومت کے ایوانوں تک محدود تھی۔ ان کے خلاف جذبہ نفرت کا یہ عالم تھا کہ آزادانہ چلنا پھرنا ان کے لئے دشوار تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے عشرت کہروں میں گوشہ گنئی میں گم ہو گئے۔

بالآخر تحریک آزادی کا یہ تشددانہ دور ختم ہوا۔ یہ تحریک ہر وہ وقت کے ساتھ زور پکڑتی گئی۔ لیکن اس

سلسلہ ملحوظ ہے کہ مقالہ زیر لفظ میں تحریک آزادی سے مراد صرف وہ جنگ حریت ہے جو مسلمانین ہند کو تحریک خلافت اور بعد میں تحریک پاکستان کی صورت میں لڑنا پڑی۔ ہندوؤں کی تحریک اس کے بعد بھی تشددانہ رہی کیونکہ ان کی تحریک کی بنیاد ہی تحریف و تزیین پر تھی۔

میں تشدد و دہشت انگیزی کی بجائے آئینیت (Constitutionalism) کا عنصر غالب ہوتا گیا۔ یہ ہم ناکامیوں اور غیر منظم مصائب نے عوام کو تھکا دیا۔ اس موقع پر ایسے قارئین میدان میں نکلے جو قوم کے مصائب پر مضطرب تھے۔ انھیں تحریک آزادی سے پوری ہمدردی تھی لیکن وہ بالعموم ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک تھے۔ ان کے جبر کی موجوں میں اضطراب نہیں تھا اس لئے وہ اب تک طوفان آشنا قوم کی قیادت کے اہل نہ سمجھے جاتے تھے۔ آئین پسندی کا دور شروع ہونے پر یہ حضرات منظر عام آگئے۔ انہی گرم مزاج معتدلیں کے سرخیل قائد اعظم تھے۔ قائد اعظم ایک دوستانہ شخصیت میں اور محتاط سیاستدان اور ماہر آئین ہونے کی حیثیت سے قوم کی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ مزید ہنگامی قربانیاں مسلمانوں کے لئے مفید نہیں۔ نہ وہ اس کے اہل ہی ہیں۔ لہذا انھوں نے اپنی قیادت میں مسلم سیاسیات کو اس نفع پر چلایا کہ اس سے تصادم کا کم سے کم امکان تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی قیادت عظمیٰ بنھائے ہی اعلان کیا کہ وہ تصادم (براہ راست اقدام) کو خودکشی کے مرادف سمجھتے ہیں۔ انھوں نے قوم سے گویاں یا لاشیاں کھانے، جیلوں میں جانے، عدم تعاون کرنے یا تشدد و انتشار روائی کی بجائے اتحاد اور تنظیم کی اپیل کی۔ مسلمانوں کو اپنے جذبات قابو میں رکھنے کی تلقین کی۔ جوش و غضب کے غیر آئینی مظاہرہ سے روکا۔ گویا اب دماغی اور کاغذی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں حکومت کے غائب کا خطرہ نہ تھا۔ ایک تو اس لئے کہ یہ آئین و قانون کی حدود سے باہر نہ تھی اور دوسرے اس لئے کہ زمانہ بدل چکا تھا۔ اب وہ وقت نہیں رہا تھا کہ آزادی کا تصور بھی بغاوت قرار دیا جائے۔ آزادی کے چرچے عام ہونے لگے تھے۔ اب ہر شخص آزادی، بسیک یا انعام کے طور پر نہیں بلکہ اپنا پیدائشی حق سمجھ کر طلب کر رہا تھا۔ آزادی کی پکار گلی کوچوں میں گونجنا شروع ہو گئی تھی۔ سیاست کے اس آئینی دور میں ذہنی مناصب و مراعات کھوجنے کا اندیشہ نہ تھا۔

سیاسی جدوجہد کے اس پرسکون اور آرام دہ پلٹنے نے جان ان کارکنوں کو میدان سے ہٹا دیا جو آئین پسندی کو بزدلی اور کمزوری سمجھتے تھے، وہاں ان عافیت کوش اور آرام طلب بزرگوں کو سامنے لاکھڑا کیا جو اب تک سیاسی تحریک سے الگ تھلگ رہنے اور حکومت کی طرفداری کرنے کے سبب



عوام میں اپنا دقراضع کر بیٹھے تھے۔ ان بزرگوں کو اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ایک عمدہ سوتق ہاتھ آگیا۔ وہ مسلم لیگ کی بے ضرر تحریک میں جوق در جوق شامل ہونا شروع ہو گئے۔ قائد اعظم کو اس وقت جاں باز کارکنوں کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ ایسے آدمی اپنے گرد چاہتے تھے جو ان کی لفظی تائید کرتے رہیں۔ چونکہ قائد اعظم قوم کے سامنے چند سے کے لئے ہاتھ پھیلانا بھی نہیں چاہتے تھے، اس لئے انہیں ایسے صاحب ثروت حضرات کی ضرورت تھی جو لیگ سے کچھ طلب نہ کریں بلکہ لیگ کے لئے انہیں جو کچھ خرچ کرنا ہوا اپنی گروہ سے کریں۔ اس متمول اور کھاتے پیتے طبقہ کی شمولیت لیگ سے قائد اعظم کو لیگ کے مایات کی طرف سے بے فکری ہو گئی اور وہ، یکسو ہو کر، پاکستان کی آئینی جنگ لڑنے میں لگ گئے۔ غریب، لیکن آزمودہ کار، کارکن لیگ سے کچھ عرصہ تک شکوک و شبہات کی بنا پر علیحدہ رہے لیکن جب انہوں نے اس میں آنے کا فیصلہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس جماعت پر بالعموم وہ لوگ غالب آچکے ہیں جن کا سابقہ کردار کچھ زیادہ قابل فخر نہیں رہا اور جو لیگ کے نام پر محض اپنی کھوئی ہوئی حیثیتیں پھر قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ رفتہ رفتہ دولت و سرمایہ کا لیگ کی تنظیم میں اس حد تک نفوذ ہو گیا کہ عملی طور پر اس جماعت کے دروازے غریبوں پر بند ہو گئے۔ جو غریب کارکن لیگ میں داخل ہوئے وہ کسی وقت بھی اگلی صفوں میں نہ آسکے۔ کیونکہ لیگ میں ذمہ داری کا مقام لینے کے لئے معیار ہی دولت و سرمایہ قرار دے دیا گیا تھا۔ گو کاغذی طور پر لیگ ایک جمہوری ادارہ رہی لیکن جمہور کے صحیح نمائندوں کی آواز کسی وقت بھی اس نفاذ نے میں موثر نہ ہو سکی۔ "قومی خدمت" کا معیار وہ تقریریں تھیں جو جلسہ ہائے عام میں کی جاتی تھیں یا وہ بیانات جو اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں غریب کارکنوں کی دسترس سے باہر تھیں۔ ان کے پاس اس قدر سرمایہ نہ تھا کہ وہ ریل گاڑی کے اعلیٰ درجوں یا ہوائی جہازوں میں سفر کی سعادت برداشت کر کے مختلف مقامات پر تقریروں کے لئے جاسکتے، نہ ان کی دنیوی حیثیت اس قدر جاذب تھی کہ اخباری نمائندے ان کی جانب کچھ چلے آتے۔ اس محرومی کے سبب وہ قوم کی خدمت نہ کر سکے۔ لہذا تنظیم لیگ میں وہ کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔

سرمایہ کی کمی واقعی ایک ایسی رکاوٹ تھی جسے دور کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ سالانہ

یائیک کو نسل کے اجلاس میں ان کی شرکت ایک کٹھن منزل ہوتی تھی۔ اگرچہ انہی غریبوں میں ایسے ایسے قلمدرہ بھی موجود تھے جنہوں نے لیگ کے جلسوں میں شمولیت کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنے کھیتوں تک کو گروی رکھا۔

دولت و سرمایہ کے علاوہ اس مغل میں دوسرا معیار فضیلت انگریزی دانی تھا۔ قائد اعظم کی مہجوری تھی کہ وہ اپنے دلی جذبات اردو زبان میں اُس بے تکلفی کے ساتھ ظاہر نہیں کر سکتے تھے جس طرح انگریزی زبان میں آئینی و سیاسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کرنے کی بجائے انہیں بزبان انگریزی ادا کر دینا زیادہ سہل تھا۔ اسمبلیوں اور دوسری کانفرنسوں میں ذریعہ اظہار انگریزی تھا۔ اس رواج اور قائد اعظم کی مہجوری مجالس لیگ کی کارروائی بھی ساری یا بیشتر انگریزی میں ہوا کرتی تھی۔ ایسی صورت میں انگریزی جاننے والوں اور انگریزی نہ سمجھنے والوں کا ایک مغل میں بیٹنا دشوار یا بے معنی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو داں اول تو مجالس لیگ تک پہنچ ہی نہ سکے اور جو اس مقام بلند تک پہنچ سکے ان کے لئے

زبانِ یارِ من انگلش دمن انگلش نمی دامنم

کا عجب حاصل تھا جس سے ان کی حیثیت ایسی مجالس میں غریب الدیار کی رہ گئی۔ ہر چند شروع میں یہ چیسرہ ضرورت کے پیش نظر کی گئی لیکن رفتہ رفتہ انگریزی ہی ذریعہ اظہار خیالات بن گئی۔

لیگ میں متول اور ذی ثروت حضرات کی شمولیت سے لیگ کو مالی تفکرات سے نجات مل گئی کیونکہ قائدین کے دورے میں سوال کیہ "حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ انگریزی کے استعمال سے ہولت کار کے علاوہ وقت کی بچت بھی ہو گئی کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آئینی و سیاسی مسائل پر اظہار خیال جس بلکہ مصلحتی کے ساتھ انگریزی زبان میں ہو سکتا ہے اردو میں نہیں ہو سکتا۔ آزاد قوم کی زبان ہونے کی حیثیت سے انگریزی ایک امیر زبان ہے۔ اردو اس کے مقابل میں بہت بے مایہ ہے۔ وقتی طور پر لیگ کو ان دو عوامل سے بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن ایک مستقل اور عظیم نقصان، مسلمانوں کی ملی تنظیم کو یہ ہوا کہ لیگ صرف "ضرورت کے" ارکان کی مجلس بن گئی۔ اور یہ کہا جا چکا ہے کہ یہ ضرورت کے "ارکان" جو صاحب سرمایہ اور انگریزی دان تھے، اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو عوام سے قطبیں کا بُدر رکھتا تھا۔ یہ بُد جمانی ہی

نہیں تھا، لہٰذا ہی بھی تھا۔ دونوں کی ضروریات و مقتضیات میں اختلاف تھا۔ دونوں کی نظر ایک نہ تھی۔ دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اور یہ بھی بالوضاحت کہا جا چکا ہے کہ لیگ کے یہ ارباب اختیار اس جلد وساکت گروہ سے نکلے تھے جو اب تک ہر قسم کی سیاسی تجارتیک سے دور ہی نہیں بلکہ، سیر و نفی اقدار کے اجیر کی حیثیت سے، ان کا مخالف بھی رہا تھا۔ قومی خدمت سے زیادہ ذہنی عیاشی ان کا مقصد تھا۔ ان کی دلچسپی کے مراکز ضرور بدلے لیکن بنیادی چیز بدستور رہی۔ ان کی لندن و پیرس کی عفت کا یہ قومی مجالس اور لیٹ فارم میں منتقل ہو گئیں۔ وہ جہاں جاتے تھے ان کا شاہانہ خیر مقدم ہوتا تھا، زندہ باد کے نعرے لگتے تھے اگلے میں پھولوں کے ہار پڑتے تھے، لقر پر بستے کے لئے ہزاروں اور لاکھوں عقیدتمندوں کے اجتماعات ہوتے تھے۔ جس قوم کو وہ اپنے سابقہ اعمال سیاہ کی بدولت، مشہور نہ دکھا سکتے تھے اُس میں یہ عزت و توقیر — ٹوٹنے کی جائے ہے! یہ سودا کچھ نفع بخش نہ تھا۔ قوم میں اپنا کھویا ہوا قارو باہ حاصل کر لینے کے بعد وہ باسانی اسمبلیوں کے ایوانوں تک بھی پہنچ گئے۔

غریب اور مخلص کارکن اس دور میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنی رضا کار کی حیثیت سے دیہات کی خاک چھان سکتے تھے، وہ جلسوں کے اہتمام میں بے مزد خادم کی حیثیت سے کھڑے ہو سکتے تھے، وہ جلسہ گاہ کی زیب و زینت کے لئے شب و روز ایک کر سکتے تھے، وہ آنے والے لیڈر کا سامان اپنے کندھے پر اٹھا سکتے تھے، وہ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر زندہ باد کے نعرے لگا سکتے تھے، لیکن وہ لیگ کے نظام پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے، وہ اپنے قائدین کو مشورہ نہیں دے سکتے تھے، ان کی رائے و قیاس نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ انھیں اپنی رائے کے اظہار کا موقع ہی نہیں مل سکتا تھا۔ ان کی امیدوں کا سہارا نہ کسی کے ایک قائد اعظم کی شخصیت تھی لیکن قائد اعظم کو ایک ایسے حلقہ نے گھیر رکھا تھا کہ ان تک کسی غیر کی رسائی ممکن نہ تھی۔ قائد اعظم کو اکثر صحیح حالات اور قوم کے صحیح جذبات سے بے خبر رکھا جاتا تھا اور ان تک صحیح حالات پہنچانے کی تہم راہیں بند تھیں۔ قائد اعظم خود ملنے میں بہت فیاض تھے لیکن ان سے ملاقات کا عمل اکثر ایسا پرتیبیح ہوتا تھا کہ قائد کی یہ فیاضی قوم کے کسی کام نہ آ سکتی تھی۔ اکثر ایسا ہو گیا کہ قائد اعظم ایک جگہ تشریف لے گئے۔ مقامی علمائین لیگ نے یہ غدر پیش کر کے کہ قائد اعظم کی جگہ

خطرہ ہے اُن کی جائے قیام پر پہرہ لگا دیا۔ اس حفاظتی انتظام میں مخصوص لوگوں کو ہی رسائی کی اجازت تھی اور اس کے لئے بھی رشرٹ لگا دی گئی کہ جب تک کسی شخص کو لیگ کے فلاں ذمہ دار صاحب اجازت نامہ نہ دیں وہ قائد اعظم تک نہیں جاسکے گا۔ یہ فلاں صاحب اور دیگر مقامی عمائدین لیگ عثمانیہ رواترین لوگ ہوتے تھے جن سے مخلص ارکان اور عوام متنفر ہوتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ قائد اعظم کو اُن کی سیماہ کاریوں سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ قائد اعظم تک پہنچ سکیں۔ قائد اعظم کو سب ٹھیک کہہ دیا جاتا تھا اور ان لوگوں کی سیادت کو کوئی زک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ان امیر لیڈروں کی تمام کارگزاری کا خلاصہ نکالا جائے تو اس سے زیادہ انہوں نے قوم اور لیگ کی کوئی خدمت نہیں کی کہ انہوں نے چند ایک سوالات پر قوم سے ہاں کرائی۔ مثلاً

کیا تم پاکستان چاہتے ہو؟ (ضرور چاہتے ہیں)

کیا تم پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہو؟ (بالکل تیار ہیں)

کیا تمہیں قائد اعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد ہے؟ (کامل اعتماد ہے)

حالانکہ یہ ایک بے معنی سی بات تھی۔ لیگ کے جلسوں میں اس قسم کی قراردادوں کی منظوری، کہ ہمیں قائد اعظم پر مکمل اعتماد ہے، ایک مذاق تھا۔ جب تک قائد اعظم لیگ کے صدر تھے اس وقت تک ان پر اعتماد کے اس رسمی اعلان کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ بہر حال یہ مذاق ہوتا رہا اور یاد رکھئے کہ یہ کوئی اتھاقی چیز نہ تھی اور نہ یہ قائد اعظم کی ذات سے کسی بے ساختہ عقیدت کا اظہار تھا بلکہ قوم پر یہ عمل توخیم تھا تاکہ وہ ان مخصوص و محدود قراردادوں کے باہر کچھ نہ دیکھ سکے اور اسی پیچ میں الجھی رہے۔ ان لیڈروں نے ایک جھنڈا، ایک پیٹ فارم، ایک لیڈر کے نعرے لگائے لیکن وہ خود جانتے تھے کہ اس کی حیثیت ایک نعرہ سے زیادہ نہیں۔

ان لوگوں نے لیگ سے یوں قائد اعظم اٹھایا۔ قائد اعظم نے ان لوگوں کو ملی مفاد کی خاطر یوں استعمال کیا کہ جب کبھی لیگ کے دعویٰ ناپائیدگی میں شک ہوتا تھا انہیں نشانے کے ہاتھی کی حیثیت سے پیش

کر دیا جاتا تھا کہ دیکھو ایسے ایسے ذی اثر صاحب حیثیت آدمی لیگ کے ساتھ ہیں۔ وقتی طور پر یہ نمائشی تنظیم خوب کام دے گئی لیکن لیگ کسی وقت بھی ایک عوامی جماعت نہ بن سکی، نہ اس میں حقیقی تنظیم پیدا ہو سکی۔ اس نمائشی تنظیم کا جو حشر ہوا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ کاغذی گھروں کا ہوا ہے لیگ کے ہلکے سے جھونکے کی بھی تاب نہ لاسکا۔ مصائب و آلام کا وہ قیامت خیز طوفان، جو تقسیم کے ساتھ ہی ہم پر اُمتڈ پڑا، خارجی عوامل سے کہیں زیادہ داخلی نظام کے کھوکھلے پن کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں نے اس عظیم قیامت میں اپنے آپ کو بالکل تنہا اور کس پر سی کی حالت میں پایا۔ ان کی نظر بس بے تابانہ اُن قائدین کو ڈھونڈتی تھیں جو اب تک مسلمانوں کی ملی سیاست کے ہر مرحلہ پر پیش پیش رہے اور جن کو قوم نے اسلام کے نام پر ووٹ دے کر اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کیا تھا۔ ملت کے یہ منتخب نمائندے اور قوم کے غم میں نثر حال ہونے والے لیڈر سب سے پہلے مشرقی پنجاب سے بھاگے۔ ان کے غفلانہ فرار کے بعد غیر منظم و غیر مسلح مسلمانوں کا اس افراغی کے عالم میں بھڑکے کی طرح ذبح ہونا اور بھاگ نکلنا قابل فہم ہے۔ جس جگہ کوئی ایک شخص بھی مسلمانوں کو یہ آواز دینے والا باقی رہا کہ "مسلمانو! ٹھہرو!!" وہاں انہوں نے جم کر مقابلہ کیا، اور وہ حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے مارے گئے، وہ غیرت مندوں، بہادروں اور شجاعوں کی موت مرے۔ دوسری طرف لاکھوں مسلمان اپنی لیگ اور لیگ کے لیڈروں کو بھارت سے بھاگ کر دشمن کے ہاتھوں کٹ گئے یا انہاں و خیزاں پاکستان آ پہنچے۔ پاکستان میں آکر بھی یہ پریشان روزگار مسلمان اس کاٹنے کی پیم چھین محسوس کر رہے ہیں کہ یہاں کی لیگ اور لیگ لیڈر بھی ان کے درد کا دریا نہیں جو سکتے۔ پاکستان کے لیگ لیڈروں میں اس قدر قیامت کے بعد بھی، بیگانگی برہتی جا رہی ہے۔ اب بھی وہ عوام کے قریب ہو کر ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر اس نئے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے کہ وہ ایک غیر حکومت کے زیر نگیں آچکے تھے جس کی محاذ میں ان کے جان و مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہ تھی۔ خود مغربی پنجاب میں غالب اکثریت میں اپنیوں کی حکومت میں رہتے ہوئے بھی مسلمان اپنے آپ کو خستہ و خراب پاتے ہیں۔ مثلاً ضلع راولپنڈی میں مارچ ۱۹۴۷ء کے بعد جو کچھ ہوا یہ ایک طویل اور جگرگداز داستان ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ العزیز آئندہ فرصت میں پیش کی جائے گی۔ اب بھی، قیام

پاکستان کے بعد، وہاں یہ حالت ہے کہ عوام مایوس و افسردہ ہیں اور لیڈر اپنے حال میں مست ہیں۔ عوام کی افسردگی اور لیڈروں کی حال مستی کا اندازہ ذیل کے دو واقعات سے بخوبی ہو سکے گا۔

شروع اکتوبر ۱۹۴۷ء میں، پنجاب لیگ کے ایک بطلِ عظیم بھائی امن کے دورے کے سلسلے میں گوجر خاں (ضلع راولپنڈی) تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اس روز جمعہ تھا۔ مسلمان لازمی طور پر توجع رکھتے تھے کہ یہ صاحبِ جبر اسلام کا نام لے لے کر اس مقام تک پہنچے ہیں، نماز جمعہ میں شریک ہوں گے، لیکن انھوں نے غریب مسلمانوں کے ساتھ نماز جمعہ پڑھنا خلاف شان سمجھا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عین نماز جمعہ کے وقت ڈاک بنگلہ میں جلسہ کیا اور اس طرح کھلم کھلا شعائرِ اسلامی کا استخفاف کیا۔ متوزے دنوں کے بعد انہی کی جڑ کے ایک اور قائد لیگ، غیر مسلموں کی بھائی کے جنون میں گوجر خاں گئے۔ اتفاق سے یہ بھی جمعہ کا روز تھا پہلے صاحب نے جامع مسجد سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر جلسہ کیا تھا لیکن انھوں نے جامع مسجد کے ساتھ ہی کچہری کے باہر جلسہ کیا۔ جلسے کے دوران میں مسجد میں اذان ہوئی۔ انھوں نے اذان کے احترام میں تقریر بند کر دی۔ اذان ختم ہونے پر کلمہ بھی پڑا۔ پھر تقریر شروع کر دی۔ دو بجے تقریر ختم کی۔ لیکن نماز جمعہ میں شریک ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ جلسہ گاہ جامع مسجد سے اتنے فاصلے پر تھی کہ امام کی قرأت وہاں صاف طور پر سنائی دیتی تھی۔

اے کاش ہمارے قائدین غریب عوام کے جذبات سے آگاہ ہونے کی بجائے ان کے بدلے ہوئے تیمور ہی دیکھ لیتے جو ان کے پاس بدوردہ جذبات کی غمازی کر رہے تھے۔

## مسلم لیگ کو بحیثیت پارٹی منظم کر دیا جائے

مسلم لیگ کے سابق کارکن نے سطور بالا میں مسلم لیگ کی سابقہ تنظیمی خامیوں کا جائزہ لے کر آئندہ کیلئے اسے متنبہ کرنا چاہا ہے لیکن طلوع اسلام اس مسئلہ کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور وہ یہ ہے۔ ساری خامیوں کے باوجود مسلم لیگ نے جس پاکستان بنوایا، یہ مسلم لیگ کی اہم ترین کامیابی اور پاکستان کی اہم ترین خامی ہے۔ مسلم لیگ سیاست کا رخ سوائے پاکستان بننے میں کھلیا بغیر رہا لیکن ملت پر انقلاب پیدا کر کے اور نہ اسے دہشت و شہنشاہی پاکستان کی بنیاد بنانا

گرتے پڑتے پاکستان تک پہنچی، حالانکہ قائدین ملت روال دواں پہنچے۔ بہر کیف پاکستان اب زندہ حقیقت ہو اور اس سے ہمارے سیاسی تقاضے اور ملی مطالبے بدل جاتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان مرکز سے عمل ہے۔ چونکہ ہمارا تصور پاکستان و وطنیت کے عام سیاسی تصور سے جداگانہ ہے اس لئے ہماری ذمہ داری نہایت نازک اور اہم ہے۔ ہم فیصلہ کن دور میں ہیں۔ ہماری آئندہ تاریخ مملکت پاکستانیہ ہی کی نہیں ملت انسانیہ کی تاریخ ہے۔ ہمارے آج کے عزائم، آج کے اعمال اور آج کے فیصلوں سے ترتیب پائے گی۔ پاکستان کی خاک کا ایک ایک ذرہ اس خورشید حقیقت کا آئینہ بر دار ہے کہ

کنتم خیر امةٍ اخرجت للناس

اب تک مسلم لیگ برصغیر ہند کی متحکم سیاسی جماعتوں میں کی ایک جماعت تھی۔ چونکہ اس کے نظریہ اور ویش نہاد سے اختلاف رکھنے والے گروہ ملت میں موجود تھے اس لئے ہندو اور انگریزوں کے مقابلہ میں راج اور عام جمہوری ضوابط کے مطابق، اسے یہ ثابت کرنا پڑا تھا کہ ملت کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ بدیں غرض اسے انتخابی معرکوں سے دوچار کرنا اور دعویٰ نمایندگی ملت کا ثبوت ہیا کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے انتخابات عامہ اسی ایثور پر لڑے گئے کہ مسلمانان ہند پاکستان چاہتے ہیں اور مسلم لیگ کو اپنی واحد نمایندہ جماعت سمجھتے ہیں۔

اب پاکستانی مسلم لیگ اپنی تنظیم نو میں مصروف ہے۔ جیسا کہ اس کے نظام الاوقات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ بہت جلد اسکان کی بھرتی اور جماعتی انتخابی معرکے سے فارغ ہو جائے گی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تنظیم نو سے مسلم لیگ کی کیا حیثیت ہوگی۔ اس وقت ہماری ضرورت انتخابی جیت نہیں کہ یہ تقاضے تقسیم ہند کے ساتھ ختم ہوئے۔ اب ہمیں کسی غیر سے نہ پاکستان لینا ہے، نہ نمایندگی کا دعویٰ منوانا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم اس حسین خواب کی عملی تعبیر کریں جسے سترہ سال پیشتر علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے دیکھا تھا اور جس کے لئے آپ نے دعا کی تھی۔

نغمہ نوبہا اگر میرے نصیب میں نہ ہو

اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

ہماری ننگ و دو، قوی اور فعلی، یہی رہی کہ ہم ایسا قطعہ ارض چاہتے ہیں جہاں نظارہ اسلام کوراج و نافذ

کر سکیں۔ اب وہ قطعہ ارض میسر آچکا ہے۔ اب ہمیں پرانے طریق کار کو جو حالات گذشتہ میں بھی خام اور ناقص تھا، چھوڑ کر بدلے ہوئے حالات کے مطابق وہ لاکھ عمل اختیار کرنا ہو گا جو ہمارے پیش ہمارے حصول کا ذریعہ ثابت ہو۔

آئیے دیکھیں کہ پاکستان مسلم لیگ کی ترجیح نو کیسے ہوگی۔ مسلم لیگ کا پہلا قدم ارکان کی بھرتی ہوگی (یہ کام ان دنوں شروع ہے) دستور و ضوابط کے مطابق پاکستان کا ہر مسلمان شہری جس کی عمر اٹھارہ سال ہو چکی ہوگی اس کا اعلان بہ دستخط کر کے کہ مجھے پاکستانی مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے اتفاق ہے اور میں اس کے قواعد و ضوابط کا پابند ہوں گا اور دو آنے سالانہ چندہ ادا کر کے کسی ابتدائی لیگ کا رکن بن سکتا ہے۔ پاکستانی مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ہر مسلمان کو اس میں اتفاق ہے کہ پاکستان نظام قرآنی کی تجربہ گاہ ہے۔ پاکستان کی وحدت و استقلال درحقیقت نظام قرآن کے نفاذ کا نتیجہ ہے اور قرآنی نظام کا نفاذ مسلمان کا ایمان ہے۔ اور ہر مسلمان کو اس سے اتفاق ہی نہیں بلکہ یہ ہر مسلمان کی معراج کی تائید ہے۔ جو مسلمان اس اصول سے منحرف ہے وہ مسلمان نہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر مسلمان اسلامی نظام کا تحفظ چاہتا ہے تو پھر یہ شرائط و مذاق رکھتے کیا معنی رکھتے ہیں؟ کیا مسلم لیگ پاکستان کے ہر اٹھارہ سال کے مسلمان کو مسلم لیگ کا رکن بنا دے گی؟ یہ ناممکن ہے۔ دنیا کی کوئی سیاسی جماعت آج تک اس معراج کمال کو نہیں پہنچ سکی۔ لیگ نے بہت بڑا تیر مارا تو پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں میں سے لاکھوں کو رکن بھرتی کر لے گی۔ تو کیا آئندہ حکومت صرف ان چند لاکھ کی نمائندہ ہوگی؟ ملت کی اکثریت جو رسمی طور پر لیگ کی رکن نہیں ہوگی ان کی نمائندگی کون کرے گا؟ اکثریت کو نمائندگی سے محروم کرنا جو جمہوریت کے منافی ہے۔ جمہوریت اکثریت کو حق حکومت دیتی ہے۔ یہاں آپ اکثریت سے یہ حق چھین کر اقلیت کو دے رہے ہیں اور یہ فیصلہ آپ انہی اصولوں کے مطابق کر رہے ہیں۔

جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ جو مسلمان مسلم لیگ کے رکن نہیں ہوں گے انہوں نے صرف رسم و مذاق پوری ادا نہیں کی ہوگی ورنہ وہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں گے جس کی نمائندگی مسلم لیگ کرتی ہے۔ لیکن یہاں سوال مسلم لیگ سے نظری اتفاق کا نہیں بلکہ سوال ملت کو شریک حکم و حکومت کرنے کا ہے۔



مسلم لیگ کے عہدیدار لہذا حکومت کے ارکان صرف وہی لوگ ہو سکیں گے جو کسی نہ کسی ابتدائی لیگ کے رکن ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ جو حق پاکستان کے مسلمان کو صرف مسلمان ہونے سے حاصل ہے آپ وہ حق اس سے کیوں چھین رہے ہیں؟ اس مطلق حق کو متبادر و مشروط کیوں کر رہے ہیں؟ ایک مسلمان کے لئے یہ کہوں ضروری قرار دیا جا رہا ہے کہ وہ آپ کے فارم کی بھی جانہ پُری کرے۔ وہ پاکستان کا رہنے والا مسلمان ہے اور اس کا ایمان ہے کہ پاکستان کا استحکام برائے تنفیذ نظام قرآن ضروری ہے۔ لہذا اس ایمان کی بنا پر اسے تمام حقوق حاصل ہیں۔ پھر مزید شرط کیسی؟

اس نظری حیثیت سے آگے بڑھ کر علی حیثیت کی طرف آئیے۔ آپ نے کچھ لوگوں سے فارم پری کر کے انہیں لیگ کا ممبر بنایا۔ باقی لوگ وہ رہ گئے جنہوں نے فارم نہیں بھرے۔ اب ظاہر ہے کہ جنہوں نے فارم نہیں بھرے وہ لیگ کے مقابل میں کسی پارٹی کے ممبر نہیں ہیں بلکہ محض وہ مسلمان ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے لیگ کے فارم نہیں بھرے۔ کل کو حکومت کے انتخابات کا وقت آتا ہے۔ لیگ ایک شخص کو امیدوار قرار دیتی ہے۔ جن لوگوں نے لیگ کے فارم نہیں بھرے تھے ضروری نہیں کہ وہ اس شخص کی مخالفت کریں۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی الگ پارٹی نہیں بنائی۔ یہ امیدوار خود ان کا بھی نامزد ہو گا۔ یہ اپنے میں اور اس میں کوئی فرق نہیں کریں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لیگ کی ممبری کے لئے خانہ پری کے یہ مکلفات سہی لا حاصل اور کوشش بے معنی ہیں۔ پاکستان کا ہر مسلمان، بجز ان بدبختوں کے (اگر کوئی ایسے ہیں) جن کے پیش نظر پاکستان کی تخریب ہے، پاکستان کی جماعت عظیم کا رکن ہے اور بلا تخصیص ہر حق کا مستحق۔ اس لئے لیگ کی رکنیت و عدم رکنیت بے معنی چیز ہو گئی۔

جو کچھ اور لکھا جا چکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر دہرائیجئے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جہانمان پاکستان قرآنی نظام حکومت کی ترویج و تنفیذ چاہتے ہیں۔ اور جب تک وہ مسلمان ہیں وہ ایسا ہی چاہیں گے۔ تو کسی پارٹی کی طرف سے ان سے ميثاق ہائے رکنیت پر کسی عہد نامہ کے بہانہ سے ہی کیوں نہ ہو، کیوں دستخط لائے جائیں؟ جب کوئی مسلمان مسلم لیگ کے ميثاق رکنیت پر دستخط کرے گا تو اس میں کونسی اندرونی تبدیلی پیدا ہو جائیگی جو اس شخص میں منعقد ہوگی جس نے کسی وجہ سے اس ميثاق پر دستخط نہیں کئے؟ حقیقی ميثاق تو اس کا

ایمان ہے جو قلبی کیفیت و ایقان کا نام ہے۔ وہ کاغذی عہد ناموں کا محتاج نہیں۔ اگر مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد اس ایمان کے جزئی نتائج ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اصل کو چھوڑ کر فرعیہ پر بیعت کیوں لیں؟ کیوں نہ اسی اصل کو اجاگر کریں اور اسی سے تسک کریں؟ یہ میثاقِ فالٹو اور غیر ضروری پابندی ہے۔ پھر اگر یہ چیز محض غیر ضروری اور بے معنی ہی ہوتی تو ہم شاید اسے گوارا کر لیتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑے خطرہ کا موجب بن جائے گا۔ اس لئے کہ اس سے ایک سیاسی پارٹی تشکیل ہوتی ہے جس کے نتائج خطرناک ہیں۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے اس وقت کسی وجہ سے فارموں پر دستخط نہیں کئے وہ کسی وقت خود ایک جداگانہ پارٹی بن کر لیگ کے حریف کی حیثیت سے فریقِ مقابل بن جائیں اور ملت اسی لعنت میں گرفتار ہو جائے جس میں آج اقوامِ مغرب بری طرح گھری ہوئی ہیں۔

حکومتِ چند انسانی دماغوں کے فیصلوں سے ترتیب پاتی ہے اس سے کئے انکار ہو سکتا ہے کہ حینیت اور خلوصِ عزائم کے باوجود انسانی دماغ سے بہر حال غلطی کا امکان ہے اور چونکہ انسان اپنے اعمال پر خود تنقید نہیں کر سکتا اس لئے اس کے لئے یہ دیکھنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کہاں غلطی کر رہا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک کے اعمال کا جائزہ لینے والا کوئی دوسرا ہو؟ اسی کو تنقیدِ صالحہ کہتے ہیں۔ جس کے بغیر کوئی نظامِ حکومت مستحکم و مرتفع نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے دنیاوی نظامِ جمہوریت میں حزبِ مخالف *Opposition Party* کے وجود کو ناگزیر سمجھا گیا ہے۔ لیکن ان حکومتوں کے حزبِ مخالف اور قرآنی نظام کی جماعتِ محاسب میں ایک بہت بڑا اصولی فرق ہے۔ ان حکومتوں میں حزبِ مخالف نام ہوتا ہے اس جماعت کا جو انتخاب میں شکست کھا جانے کی وجہ سے اپنی حکومت مرتب نہ کر سکے اور اکثریت کی قائم کردہ حکومت کے مقابلہ میں ایک فریقِ مخالف کی حیثیت سے صفت آرا ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت اس فریقِ مخالف کی تنقید اور مخالفت کے خوف سے ایسے عزائم و اعمال سے مجنب رہنے کی کوشش کرتی ہے جس پر اعلیٰ اٹھائی جا سکے اور اس طرح وہ ناقذ بے زمام نہیں ہونے پاتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس اصلاح کا جذبہ محرکہ تخیلی و تریبی ہو اس کا نتیجہ آئیں و ضوابط کی غلطی پابندی تو ہوتی ہے، بشرطِ انسانیت کی بالیدگی نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی جس طرح خوفِ پاسبان سے چوری سے اجتناب شرافت و سعادت کا موجب نہیں بن سکتا۔

زندگی کے اس موڑ پر کہ ہم یہاں سے نئی اور صحیح ماہ تلاش کر سکتے ہیں ہم کیوں اسی راہ پر چلتے جائیں جس پر چلے آئے ہیں اور جو ہمیں متعین منزل کے قریب تر لانے سے قاصر رہی ہے، اور جسے ہم قولاً ملعون قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہم باتیں تو کریں کعبہ کی اور راستہ اختیار کریں ترکستان کا جیسا کہ طلوع اسلام میں اس حقیقت کو پیش کیا جا چکا ہے قرآن نواصی بالحقن کا عدیم النظیر انداز اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، یعنی ایک دوسرے کو حق و صداقت پر قائم رہنے کی تلقین کرنا۔ اس انداز محاسبہ میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک جماعت کا مستقل فریضہ کام کرنا ہو اور دوسری جماعت کا مستقل منصب تنقید و تفتیش۔ نظام قرآن میں جماعت میں تقسیم کار کے ساتھ ساتھ اشتراک فرائض بھی رہتا ہے اور جماعت کے ارکان ایک دوسرے کے مدد و معاون اور محاسب و ناقد بھی ہوتے ہیں۔ لہذا اس نظام میں حزب حکومت اور حزب مخالف دو الگ الگ اور مستقل پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ ملت تقسیم عمل کی رو سے نظم و نسق حکومت کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے اور تشریح و تفسیر کا بار عظیم بھی اٹھاتی ہے۔ ملت کے افراد ایک دوسرے کے اعمال کا جائزہ بھی لیتے ہیں اور باہم مدد کر تو جیسوقی و صداقت کا ہم فریضہ بھی لیا کرتے ہیں۔

اس قرآنی اصول کی روشنی میں پاکستان مسلم لیگ کی مجوزہ تشکیل جدید کا معائنہ کیجئے۔ مسلم لیگ نادانستہ طور پر ایک پارٹی کی حکومت قائم کر رہی ہے۔ یہی چیز مستحکم ہو کر فطائیت میں تبدیل ہو جاتی ہے یعنی جو حکومت اس وقت ایک پارٹی تک محدود ہے وہ بالآخر ایک فرد یا چند افراد کے ہاتھوں میں آ جائے گی۔ اگر اس کا نتیجہ شخصی آمریت نہ بھی ہوا تو حزبی آمریت *Oligarchy* تو ضرور ہوگا۔ اس سے منفی نہیں۔ اس طرح قوم کی اکثریت بتدریج حکومت سے دور ہوتی جائے گی۔ حکومت اور قوم میں بھروہی بعد اور خلا پیدا ہو جائے گا جو اب ہے۔ کیونکہ قوم کی اکثریت حکومت کو اپنی نہیں سمجھے گی۔ موجودہ خلا ایک حد تک ناگزیر ہے کیونکہ اس عبوری دور میں حکومت عوامی نہیں، لیکن آئندہ اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے اور اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ملت کا ایک ایک فرد حکومت پر اثر انداز ہو، وہ ارکان حکومت جن کے، ان کے اعمال پر تنقید محاسبہ کر سکے اور بوقت ضرورت انھیں تبدیل بھی کر سکے۔ ایسی فضا پیدا کر دی جائے تو حکومت اور ملت معاون و مددگار ہو جائیں گی اور ان کی ربط باہمی کی متاع گم گشتہ پھر سے حاصل ہو جائے گی۔ اسی میں

پاکستان کا استقلال و تحفظ مضمر ہے۔

تو اسی بالحق کی مطلوبہ فضا پیدا کرنے کے لئے صحیح لائحہ عمل یہ ہے کہ جداگانہ سیاسی جماعت کی پابندی سے ہٹا دی جائے اور بجائے جماعت اور حکومت کے علیحدہ علیحدہ نمائندے چننے کے صرف حکومت کے نمائندے ہی چنے جائیں اور نظام اس قسم کا مدون کیا جائے کہ تو اسی بالحق — تنقید و تعاون — خود بخود ہوتا رہے۔ مسلم لیگ کا جماعتی نظام تمام ملت پر نافذ نہیں کیا جاسکتا، یہ عللاً ناممکن ہے۔ اگر بعض استدلال اسے ممکن تسلیم کر لیا جائے تو ملت پر دو نظام مسلط ہو جائیں گے، ایک مسلم لیگ کا دوسرا حکومت کا۔ نظام تو ایک ہی ہو سکتا ہے۔ فرد اور ملت کا ربط یہی ہے کہ فرد اپنی تمام صلاحیتیں ملت کے سپرد کر دے اور ملت ایسی فضا — ایسا نظام — پیدا کر دے کہ فرد — ہر فرد — کہیں مسلم لیگ — اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاسکے۔ ہر فرد کو عام اس سے کہ وہ کسی سیاسی جماعت کا رکن ہو یا نہ ہو، اظہار ذات و استحکام خودی کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ لہذا جب حیات اجتماعیہ اپنی ہیئت حاکمہ (بطور مرکز) تشکیل کر لیتی ہے تو کسی اور نظام و ہیئت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لہذا ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ مسلم لیگ کو بطور پارٹی ختم کر دیا جائے۔ قیام پاکستان تک تو اس پارٹی کی ضرورت تھی لیکن اب اس کی ضرورت نہیں، کسی پارٹی کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب سلطانی جمہور کا وقت آ گیا ہے۔ اب ان نقوش کہن کو مٹا دینا چاہئے۔ اور ان کا اثر اور اس کے نیچے اس کے سب بندے۔ بس یہ ہے نظام جمہوریت اسلام۔

مسلم لیگ کے خاتمہ پر یہ سوال تدریجی نظام کا آتا ہے۔ یہ فیرضہ حکومت کا بلکہ مجلس دستور ساز کا ہے۔ اس مجلس کو چاہئے کہ دستور اساسی بلاغیر ضروری تاخیر مرتب کرے اور ایسے خطوط پر مرتب کرے کہ ہر فرد ملت حکومت کا معاون بھی ہو اور محاسب بھی۔ وہ کسی شہر میں بسنا ہو یا گاؤں میں رہتا ہو، امیر ہو یا غریب، جرنیات میں آپ سے متفق ہو یا مخالف۔ البتہ مسلمان ہو۔ اس مرکزی نظام میں منسلک ہو کر شریک حکم ہو جائے مرکزی نظام کی اساس فرو پر لکھی چاہئے اور اسے تمام افراد ملت پر حاوی ہونا چاہئے۔ یہاں سوال نظام کی نوعیت یا اس کی اساس و جرنیات کے حسن و قبح کا نہیں بلکہ اس کی ہمہ گیریت کا ہے۔ ہر فرد اس سے متعلق ہو۔ دستور کا اثر ہر فرد پر ہو اور ہر فرد دستور کو متاثر کر سکے۔ یہ باہمی تاثر نظام کی زندگی اور تقویت کی دلیل ہے۔

ایسا نظام زندہ بھی ہوگا اور زندگی بخش بھی۔

پاکستان کی آبادی بیشتر دیہات پر مشتمل ہے۔ بیشتر دیہات ایسے ہیں کہ ان کے ساحل سے کسی سیاسی جماعت کی موجیں اب تک نہیں ٹکرائیں۔ وہ اور ان کی آبادی اتنی منتشر اور شہر اور شہر پار سے دور ہے کہ سیاسی جماعتیں ان تک پہنچ نہیں سکتیں۔ حکومت کے قانون کا ان پر یا اثر ہوتا ہے کہ ان سے لگان وغیرہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ وصول کر لیا جاتا ہے اور ان کی کوئی خلاف ورزی قانون کی کمی اتفاق سے حکومت کے ایوانوں تک پہنچ جائے تو اس پر گرفت ہوجاتی ہے۔ وہ عام طور پر نظام حکومت سے غیر متعلق، غیر متاثر رہتے ہیں اور عام سیاسی تبدیلیوں کی نہ انہیں خبر ہوتی ہے، نہ اس میں دلچسپی ہی لیتے ہیں، کیونکہ ان کے معمولات زندگی ان تبدیلیوں سے مستغنی ہوتے ہیں۔ ان کو کسی نظام سے متعلق کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان تک پہنچا جائے اور انہیں موقع دیا جائے کہ مرکزی نظام کی حدود میں اپنے فرائض حیات سرانجام دیں۔ اپنی مشکلات اپنے حلقوں سے باہر ان حلقوں تک پہنچائیں جو اسی نظام کا حصہ، لہذا ان کے مدد و معاون ہیں۔ وہ اس نظام کو اپنی مقامی ضروریات کے مطابق ڈھالیں اور اپنی مقامی ضروریات کو مرکزی نظام کے تحت منمائیں۔

دیہات چونکہ منتشر ہیں اور بعض گاؤں برائے نام ہیں جن کی آبادی چند افراد پر مشتمل ہے۔ اس لئے بغرض سہولت ایسے کئی دیہات کا ایک انتظامی حلقہ بنایا جاسکتا ہے۔ اسے ابتدائی حلقوں کے لئے ایک سو کی یا حسب ضرورت کم و بیش کی آبادی کی قید لگائی جاسکتی ہے۔ اس طرح دیہات میں انتظامی حلقے پیدا کر دیئے جائیں جو مقامی لوگوں کی خواہشات اور ان کی مقامی ضروریات کے مطابق مشترک امور کو حلقہ وار سرانجام دیں۔ ان ابتدائی حلقوں کے نمائندے ثانوی حلقوں میں جائیں جو ایسے کئی ابتدائی حلقوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ انتظامی تقاضوں کے مطابق ایسے حلقوں کا تعین دشوار نہیں۔ یہ حلقے پھیلتے پھیلتے شہر، ضلع، صوبہ، اور بالآخر مرکز تک آسکتے ہیں۔ اس مربوط نظام سے مرکزی حرکت کا اثر ایک ایک حلقہ پر پڑے گا اور ایک ایک حلقہ کی جنبش مرکز تک محسوس ہوگی۔

ابتدائی حلقہ Primary Unit میں ایک منتخب مجلس ہونی چاہئے۔ ارکان مجالس کا تعین ضرورت کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔ یہ مجلس اپنے میں سب سے بہتر کو امیر صدر۔ جن لے اور خود اس کی

مجلس شوری ہو۔ ان انتخابات میں معیارِ فضیلت جو ہر ذاتی، قوتِ عمل اور اتباعِ آئینِ خداوندی ہونہ کہ دولت یا شخصی وجاہت و منصب۔ یہ مجلس مقامی امور یا محلی مشاورت سے ملے کرے۔ جن امور کا تعلق متعدد حلقوں سے ہو وہ ان حلقوں سے مشاورت کے بعد اپنا نوئی حلقہ کی مجلس میں ملے پائیں۔ یہی نظام — امیرِ مجلس شوری — ابتداء سے انتہا تک ہو۔ ہمارے موجودہ نظام میں سال ٹاؤن کیشی، میونسپلٹی، کارپوریشن، اسمبلی وغیرہ ادارے ہیں۔ بڑے قصبوں، شہروں، ضلعوں، صوبوں اور مرکز میں تو یہ ادارے معروف عمل ہوتے ہیں لیکن گاؤں میں ایسا کوئی ادارہ نہیں جو انہیں نظامِ حکومت سے مربوط و متعلق کر سکے۔ چنانچہ بڑے قصبوں سے نیچے جائیے تو حکومت کا بلدیاتی نظام ختم ہو جاتا ہے۔ اس نظام کو یہاں ختم نہیں ہو جانا چاہئے۔ اس نظام کے اس جگہ اگر رک جانے سے عوام کو اپنی پچاسی قائم کرنا پڑتی ہیں۔ ان کی حیثیت مقامی اور محلی ہوتی ہے اس لئے دیہات اور حکومت میں کوئی رابطہ نہیں ہوتا اور بالیاں دیہات کا محورِ عمل مقامی تقاضے ہی رہ جاتے ہیں۔

ابتدائی حلقوں کے بعد بالائی حلقوں کے انتخاب کا سوال آتا ہے۔ مثلاً شہری، ضلعی، صوبائی، مرکزی وغیرہ۔ یہ انتخابات بالواسطہ بھی ہو سکتے ہیں اور بلا واسطہ بھی۔ مثلاً یا تو یوں کہ ہر زیرین حلقہ اپنی مجلس شوری میں سے معین تعداد کے مطابق بالائی حلقے میں اپنے نمائندے بھیجے یا ہر حلقہ کے لئے انتخابی کالج Electoral College جدا گانہ ہوں۔ مثلاً ضلعی حلقہ کے لئے یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے متعلق حلقہ اپنی اپنی مجلس شوری میں سے ملے شدہ تعداد کے مطابق نمائندے منتخب کر کے بھیج دیں یا سرے سے نئے انتخابات کئے جاسکتے ہیں جیسا کہ آج کل ہوتے ہیں، ہم اول الذکر صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ امیرِ مجلس شوری اپنے حلقہ متعلقہ ( ) کی حکومت ہو۔ مرکزی حکومت امیرِ اعلیٰ — صدر — کابینہ اور مجلس شوری — جسے آج کل مجلسِ مقننہ کہتے ہیں — سے مرکب ہو۔ ہر حلقہ کی مجلس شوری امیر کی مشیر بھی ہوگی اور محاسب بھی۔ ہر امیر کی میعادِ امانت بھی مقرر ہونی چاہئے۔ مثلاً تین سال۔ یہی میعاد مجلس شوری کی ہوگی۔ مقررہ میعاد گزرنے کے بعد ہر حلقہ یعنی حلقہ ابتدائی سے لے کر مرکز تک انتخابات ہوں اور بالیاں حلقہ تجربہ و واقفیت کے مطابق شوری منتخب کریں جو اپنے میں سے بہترین کو امیر جن لے۔ اس میعاد کے قریب کے ساتھ یہ گنجائش ضرور ہونی چاہئے کہ بالیاں حلقہ جب چاہیں مجلس شوری یا اس کے

کسی رکن کو بدل دیں یا مجلس شوریٰ امیر کو معزول کر سکے۔ یعنی جب بھی امیر مجلس شوریٰ یا اس کا کوئی فرد ملی مفاد کے خلاف جائے تو اہل حلقہ اس پر قادر اور اس کے مجاز ہوں کہ یا تو اس کی اصلاح کر سکیں یا اسے بدل سکیں۔ اس طرح کوئی فرد خواہ وہ امیر ہو خواہ مجلس شوریٰ کا رکن کسی حلقہ پر الیا ان حلقہ کی منشا کے برخلاف مسلط نہیں رہ سکے گا۔ یہ طریقہ وہی ہے جسے آئین جمہوری میں تحریک عدم اعتماد *No Confidence Motion* کہتے ہیں۔ اس طرح اختیار ناطق منتخب افراد کے ہاتھوں سے نکل کر ملت کے سپرد ہو جائے گا جو اس کا اصلی مرجعہ اور گہوارہ ہے۔ وہ اجتماعی تقاضوں کے مطابق اس کا استعمال کرے گی۔ ایک نظام کے رائج کرنے کا یہ ایسا طریقہ ہے جس سے ساری کی ساری ملت متحرک ہوگی۔ وہ عمل بھی کرے گی اور محاسبہ نفس بھی۔ ایسی قوم

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم

کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

کے مصداق تقدیر ساز ہی نہیں انسانیت کی تقدیر بن جائے گی۔

وضاحت اور سہولت فہم کی غرض سے ہم ان گذارشات کا لمخص پیش کرتے ہیں:

مسلم لیگ کو بحیثیت پارٹی ختم کر دینا چاہئے۔ اسلامی نظام میں کسی پارٹی کی گنجائش نہیں جو حکومت کو صرف اپنے ارکان تک محدود رکھنا چاہے اور غیر ارکان کو حکومت سے بیدخل کر دے۔ کوئی ایک پارٹی جمہور کو ہمہ گیر نظام میں شریک نہیں کر سکتی۔ اس کا حلقہ اثر لامحدود ہوگا اور نتائج تباہ کن۔

نظام حکومت لاریب قرآنی ہوگا۔ (اس کی تدوین کی کیا صورت ہوگی اس کے لئے اشاعت زیر نظر کے لمعات اور علامہ آلم حیراچوری کا مضمون "قرآنی تعلیم" مناظرہ فرمائیے۔) حکومت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ دیکھے کہ کوئی فرد نظام سے باہر نہ رہے۔ ہر فرد اپنی افتاد اور صلاحیت کے بموجب نظام سے استفادہ کرے اور نظام آروئے عدل ہر فرد کو کما حقہ مستفید کرے۔ ایسے نظام کی ابتعا فرد سے ہونی چاہئے، سہولت نظم کے

لہ ہم نے یہاں محض اس اصول کی وضاحت کی ہے جس کے مطابق نظام "اجتماعی" کو اجتماعی اور ہمہ گیر بنایا جاسکتا ہے اور ہر فرد ملت کو اس میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک آئین و جزئیات آئین کی تدوین کا تعلق ہے وہ مجلس دستور ساز کا فریضہ ہے اور ہمارے اس مجتہد سے خارج۔

پیش نظر متفرق اور منتشر افراد کو انتظامی حلقوں سے متعلق کر دیا جائے۔ ہر حلقہ ایک مجلس شوریٰ منتخب کرے جو اپنے میں سے بہترین امیر کو منتخب کرے۔ ایک مجلس شوریٰ — ابتدائی حلقہ سے مرکز تک ہر حلقہ کی مجلس شوریٰ — ایک معینہ معیاد تک ہے۔ اس کے بعد انتخابات نو ہوں۔ انتخاب کا معیار جو ہر ذاتی ہو اور اتباع آئین خداوندی نہ کہ دولت اور دولت کی وسیعہ کاریاں۔ انتخابات ایک معین عرصہ کے بعد ہوں لیکن اس درمیانی وقفہ میں ملت اپنے نمائندوں کا محاسبہ کرتی رہے اور جس پر عدم اعتماد ہو جائے اس کی بجائے اور نمائندہ جن لینے کی مجاز ہو۔ تاکہ بجائے اس کے کہ ٹی لاکھ عمل سے محروم نمائندہ یا نانائندہ مجلس کو معین عرصہ تک مسلط رہنے دیا جائے اس کے فتنہ کا فوری سدباب ہو جائے اور اسے بدل دیا جائے۔

اب تک ہم نے قرآنی نظام کے سبب گہرے پیمانے پر بحث کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نظام کی ترویج پر صرف مسلمان متفق ہوں گے اور وہی اس نظام سے متعلق و متاثر ہوں گے۔ غیر مسلم اس نظام سے بددعا متعلق نہیں ہو سکتے۔ لیکن پاکستان میں غیر مسلم بھی آباد ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اب تک جس وسیع پیمانے پر جبری تبادلہ آبادی ہوا ہے اس سے پاکستان میں اقلیتوں کا تناسب بہت کم رہ گیا ہے۔ اس حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہئے کیونکہ کئی بزرگ اقلیتوں کے وجود کو بطور دلیل استعمال کر کے غیر فرقہ وارانہ جماعتوں کی تشکیل پر مصر ہیں۔ اسلام کا نظام فرقہ وارانہ تیز اور تصور کا متعلق نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نظام کو غیر مسلم متاثر نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ اس نظام سے سر تابی نہ کریں تو اس کے فوائد انھیں ویسے ہی حاصل ہوں گے جس طرح کہ مسلمانوں کو حاصل ہوں گے۔ مثلاً اسلامی نظام میں فواحش اور دیگر جرائم کا کما فیضی انہما دیا جائے گا۔ عام معاشرتی فضا عدل و مساوات اور امن سے معمور ہوگی۔ اس فضا سے ہر وفادار شہری بلا لحاظ مذہب مستفید ہوگا۔ نظام قرآنی کو مسلمانوں تک محدود کرنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ غیر مسلموں پر کچھ اور قسم کی پابندیاں لگائی جائیں گی، یا انھیں بعض مراعات سے محروم رکھا جائے گا اور انھیں مخصوص دائرے میں محدود کر دیا جائے گا۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ ان پر کسی قسم کی غیر ضروری پابندی نہیں ہوگی۔ ان کے معابد محفوظ ہوں گے۔ وہ مذہب کی آزادانہ پابندی کر سکیں گے۔ ان کی زبان، معاشرت اور روایات خصوصی کا پورا تحفظ ہوگا اور اس کے لئے مناسب آسانیاں جیسا کی جائیں گی۔ بلکہ ان کے خصوصی



عمومی انتخابات کا انتظام کرے۔ مثلاً ہر سو افراد پر ایک نمائندہ۔

(۵) یہ نظام دیہات سے شروع کیا جائے۔ ہر سو افراد پر ایک نمائندہ۔ اگر ایک گاؤں کی آبادی سو سے کم ہے تو اسے دوسرے گاؤں کے ساتھ ملا دیا جائے۔ اس طرح پرنسپل افراد کے دس نمائندے ہو جائیں گے۔ ان دس نمائندوں کا ایک حلقہ بنا دیا جائے۔ یہ اپنے حلقے میں ملت کے ترجمان ہوں گے۔ اسی طرح شہروں میں کیجئے۔

(۶) ایک تحصیل کے دیہات اور شہروں کے نمائندوں کا دسواں حصہ، اس تحصیل کا نمائندہ قرار پا جائے گا۔

(۷) ایک ضلع کی تمام تحصیلوں کے نمائندوں کا دسواں حصہ، اس ضلع کا نمائندہ حلقہ ہوگا۔

(۸) مختلف اضلاع کے نمائندوں کا دسواں حصہ، صوبہ کی نمائندہ جماعت بن جائے گا۔ اور

(۹) تمام صوبوں کے نمائندوں کا دسواں حصہ، مرکزی جماعت۔

نوٹ، دسواں حصہ ہم نے مثال کے طور پر کہا ہے۔ عملی طور پر جیسا بھی مناسب سمجھا جائے کر لیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) تمام ملت کا یہ نمائندہ گروہ، اپنے میں سے امیر اور اس کے اعیان و رفقا کا انتخاب کرے۔ یہ

ہماری مرکزی حکومت بن جائے گی۔ جو نمائندے باقی بچیں، وہ امیر کی مجلس شوریٰ یا ہماری مقننہ جماعت

ہوگی۔ اسی طرح صوبائی حکومتوں کی تشکیل ہو جائے گی۔ ضلعوں تحصیلوں اور ابتدائی حلقوں میں، یہی

نمائندے، ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپل کمیٹی اور ابتدائی حلقوں کی انتظامی کمیٹیوں کے اعیان قرار

پا جائیں گے۔

یہ تمام ارکان، اپنے اپنے حلقوں میں (ابتداء سے لے کر مرکز تک) عمال حکومت کے نگران و

محتسب ہوں گے۔

اس طرح ایک فرد ملت سے لیکر امیر ملت تک ایک صحیح جمہوری، اسلامی، نظام کی تشکیل ہو جائے گی۔

یہ نظام پاکستان کے لئے دستور کی طرح وضع اور نافذ کر دے گا۔ اس کا مختصر سا خاکہ اسی اشاعت کے لمعات میں

پیش کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیل وقتاً فوقتاً طلوع اسلام کے صفحات پر ہوتی رہے گی۔

یہ ہے وہ خاک جسے ہم صبحِ جمہوری اور اسلامی سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ نے مسلم لیگ قائم کرنی تو یہ ایک پارٹی بن جائے گی جس کے مقابلہ میں اور پارٹیاں بھی بن سکیں گی اور ملت بھر پارٹی بازی کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گی۔ پھر انتخابی معرکوں میں وہی سر پھول ہوا کرے گی اور پھر شکست خوردہ پارٹی، برسرِ اقتدار پارٹی کو شکست دینے کے لئے سرگرم عمل رہا کرے گی اور اس طرح ملت کی تمام قوتیں اسی رسک میں صرف ہو جائیں گی۔ اور اس کا وجود پارٹیوں کی نذر ہو جائے گا۔

پاکستان میں پارٹیوں کا وجود ختم کر دینے سے فقط ملت باقی رہ جائے گی اور ملت کے بہترین افراد اس کے نمائندہ ہوں گے۔ نمائندوں کے انتخاب میں، میاں انتخاب امیدواروں کے جوہر ذاتی ہوں گے نہ کہ پارٹی کے لیبیل۔ اس طرح پارٹی بازی کے جہنم سے نکل کر ہم ملت واحدہ کی جنت کی طرف آسکیں گے۔

وَذَا لِكِ الْفَوْزِ الْعَظِيمِ

قرآن کے ابدی حقائق اور جناب پوز کا حقیقت کا قلم  
دور حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

# معارف القرآن

جو اس اہل کے ماتحت مرتب کی گئی ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آ کر تامل  
اور تکمیل شرف انسانیت کیلئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات  
قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم کو سمجھنے کیلئے

اس قسم کی کوئی کتاب دنیا کی کسی زبان میں آج تک

جلد اول خدا پر ایمان، ارتقاء شرف انسانیت اور امن و سلامتی عالم کے لئے

کیوں ضروری ہے۔ بڑی قلیل صفحات چھ سو۔ قیمت مجلد دس روپے۔

جلد دوم نظریہ ارتقاء، آویزش ابلیس و آدم۔ ملائکہ اور جنات کی حقیقت۔ وحی کی ضرورت

مقام رسالت۔ پونے پانچ سو صفحات۔ قیمت مجلد دس روپے

جلد سوم آسمانی انقلاب کی بصیرت افروز حقیقت کش تاریخ۔ از ممدوح حضرت خلیل اکرم

سنا تمام انبیائے نبی اسرائیل حضرت عیسیٰ۔ حجم سو اسات سو صفحات۔ قیمت مجلد پندرہ روپے

مکمل سیٹ بہت تھوڑی تعداد میں ہیں اس لئے جلد ہی طلب فرمائیے۔

(خرچ ڈاک ہر سہ جلد تین روپے)

ناظم دارالاشاعت معارف القرآن

۲۲۱ فاؤنڈیشن۔ نیپئر بارکس۔ کراچی

# آزاد پاکستان میں پہلا یوم اقبال

”تقدیرِ اہم“ — طاؤس درباب سے نہیں، شمشیر و سنان سے بنتی ہے۔ روحِ قومی تلواروں کی جھنکار پر قص کرتی ہے اور طاؤس و درباب اسے سلا دیتے ہیں۔ تھکی ہوئی اور نہریت خوردہ قومیں جنگ و حیات سے فرار کی راہ اختیار کرتی ہیں تو وہ وادیِ طاؤس و درباب کی طرف بھاگتی ہیں۔ یہی ان کی موت ہوتی ہے۔ رزم و پیکار کے میدانوں میں قومیں شکست کھا سکتی ہیں، مرنے نہیں سکتیں۔ لیکن جب ان کے کان طبلِ جنگ سے نفور ہو کر نوائے جنگ سے مانوس ہونے لگ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ قومِ ہلاکت کے جہنم میں گری۔ اسی نوائے جنگ کا دوسرا نام شاعری ہے جسے قرآن نے راہِ گم کردہ قوموں کا شیوہ بتایا ہے۔

اقبال اپنی ملتِ خوابیدہ کو پیغامِ حیات دینا چاہتے تھے۔ قرآن نے ان پر عظیم القدر راز افشا کر دیا تھا کہ

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند

آدم ببرد از بے یقینی

اقبال کا خطاب انسان سے تھا لیکن سب سے پہلے ان کے پیش نظر خوابیدہ مشرق تھا چنانچہ پیغامِ پوری طرح قلب کی گہرائیوں میں اتارنے کے لئے اقبال نے مزاجِ مشرق کے مطابق نظم کو ذریعہ بیان منتخب کیا۔ چونکہ فطرت کی گرم گتروں نے طبع میں موزونیت نہایت بلند و دینیت کی تھی اس لئے وہ اپنی مخصوص اور غیر معمولی افتادِ طبع سے اس میدان میں دیگر رفقاءِ شعر کو ہزاروں فرسنگ پیچھے چھوڑ گئے۔ چنانچہ محض شعریت کی جہت سے یہی مطالعہ کیا جائے تو کلامِ اقبال چاشنی اور لطافت میں بے نظیر اور یکتا ہے۔ نظم کو اظہارِ بیان کا ذریعہ اختیار کرتے ہوئے اقبال بے خبر نہ تھے کہ طبعِ مشرق ذریعہ کو مقصود سمجھ لیا کرتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے قدم قدم پر

جتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ

کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

شاعری کا عیاریات ہے اور اقبال حیات سے حیات اجتماعی مراد لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے نزدیک شاعری تفریح و تفتن کا سامان نہیں بلکہ پیغمبری کا جز ہے جو حیات اجتماعیہ انسانیہ کی تشکیل نو کی داعی ہے۔ چونکہ اقبال کی نگاہ میں شاعر دیدہ بینائے قوم ہے اس لئے وہ یہ احساس رکھتے ہوتے ہوئے کہ شاعری گل و بلبل کی رنگینیوں اور خوش نوائیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے اپنے اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔

یارب درون سینہ دل باخبر بدہ

در بادہ نشر را نگرم آن نظر بدہ

وہ شاعروں کی طرح حدیث جام و مینا تک محدود نہیں رہ سکتے بلکہ فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تلاش کرتے ہیں۔ اقبال کا کلام شروع سے ہی "جان دیگر" کا انہماق تھا لیکن ان کا فکر جوں جوں رنگ و آب شاعری کی منزل سے آگے بڑھتا اور حیات کی عقدہ کشائی میں جذب ہوتا گیا اور اس طرح انھیں یقین ہوتا گیا کہ

بہل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

تو آغاز سفر میں ہی آپ نے "بمخوّر رحمتہ اللعالمین" یہ عرض کی:

گردلم آئینہ بے جوہر است      در بحر فم غیر قسراں مضراست

اسے فروغت صبح اعصار و دہر      چشم تو بمینند و مافی الصدور

پردہ ناموس فکرم چاک کن      این خیاباں راز خارم پاک کن

تنگ کن زخت حیات اندر برم      اہل ملت را نگہدار از شرم

خشک گرداں بادہ در انگور من      زہر نیز اندر سے کافور من

ردز محشر خوار و رسوا کن مرا      بے نصیب از بوسہ پاکن مرا

آغاز سفر میں ہی آپ نے یہ عہد کیا اور رحمتہ اللعالمین کو اس پر گواہ بنایا کہ ان کا کلام قرآن کا ترجمان ہو گا۔

اگر خدا نخواستہ ابھرتے ایسے کیا تو انہوں نے خود اپنے آپ پر لعنت کی یہ آخری حد بطور سزا تجویز کی کہ

روزِ معشرِ خوار و رسوا کن مرا

بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

• روزِ معشر: انسانی حیات جاوداں میں ایک فیصلہ کن روز کا نام ہے۔ اس روز انسانیت ارتقائی شاہراہ کے اس ٹوڑے پر سے مڑ رہی ہوگی جو الٰہی ربک منہجاً کی منزل کا صراطِ مستقیم ہے۔ رحمۃ اللعالمین انسانیت کے شافی نمونہ ہیں۔ انسان انسان ہے و تلاشِ مصطفیٰ سے اور اسے بہا حاصل ہے نامِ مصطفیٰ سے۔ مصطفیٰ انسانیت کے جسم سے نکال دیجئے تو انسانیت جسدِ بے روح ہے۔ انسانیت باطل۔ ساری زندگی باطل۔

میرے کلام پہ محبت ہے نکتہ لولاک

جس جرم کے لئے اقبال رحمۃ اللعالمین کے حضور روزِ معشر، لعنت کی آخری حد بطور معجزہ تجویز کرتے ہیں وہ جرم ظاہر ہے کہ کس قدر خلاف انسانیت ہوگا، ایسا جرم جس کی بخشش نہیں۔ یہ جرم ہی تھا کہ ان کا پیغام شاعری ہو جائے اور قرآن کا عکس نہ رہے۔

ملتِ اسلامیہ صدیوں سے اس حال میں تھی کہ

دلِ زندہ ہوں جس کی فغانِ سحری سے

اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہو نایاب

مسلمان سے جب سے رشتہ قرآن چھوٹا ہے اس کے ہاں شاعری شاعر پیدا ہوتے رہے جو گا گا کر اسے اور سلاتے گئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں شاعر، بساطِ حیات کے ہر گوشے پر شاعر۔ اس قوم میں صدیوں سے کوئی ایسا درویش نہیں اٹھا تھا جو اس کے عروقِ مردہ میں زندگی کا خون دوڑانا اور اسے زندگی کے تقاضوں کا احساس دلاتا۔ جب کلک ازل کا لکھا پورا ہونے کا وقت آیا اور اقبال نے اپنے زخمِ پنہاں کے ہوسے مصل کو گستاخ کر دینے، اپنے سوزِ پنہاں سے ہر شمع دل کو جلا کر تاریک راتوں میں چراغاں کر دینے اور جہاں کو وہ کچھ دکھا دینے کا تہیہ کر لیا جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا تو اس نے اپنے گرد و پیش دیکھا کہ

زمرغانِ چمن نا آشنا ایم بناخِ آشناں تنہا سرا ایم

لیکن ان کا فکرتا پختہ اور انہیں اپنے مقصد کی صداقت کا ایسا یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس تہا سرائی سے رُکے نہیں اور اپنے سامع کو انتباہ کیا کہ

اگر نازک دلی از من کران گیر

کہ خاتم می تراود از نو ایتم

اپنے 'سامع' — خریک سفر؟ — کو مزید انتباہ کرتے ہیں۔

ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم

نماری تاب آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

وہ جانتے تھے کہ ہمراہان سست عناصر ان کے آشوب و غوغا کی تاب نہیں لاسکیں گے۔ ان کا مسلک جداگانہ — اڑکھا — تھا۔ ان کی آرزوی تھی۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیر آرزو است

با من میا کہ مسلک شبیرم آرزو است

ہمراہوں کو وہ باریز آگاہ کرتے ہیں تاکہ وہ غلط فہمی میں نہ رہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ ہمراہی یونہی حسب عادت ان کو بھی ایک تیز رو سمجھ کر ان کے ساتھ ہوں۔ وہ مستقل ہم سفر چاہتے تھے یا پھر تنہا ہی رہنا چاہتے تھے۔ 'یاران محرم' میر نہ آئیں تو 'غریب' رہنا اولیٰ ہے۔ اقبال کو 'غریب' ہونے کا ہمیشہ احساس رہا۔

من اندر مشرق و مغرب غریم کہ از یاران محرم بے نصیبم

غم خود را بگویم بادلِ خویش چہ مصنوعانہ غربت را فریبم

ہمارا پہنچتی ہے اور گلِ نخستیں، چین میں کوئی ہم نفس نہیں دیکھتا تو

بہ آ بجو نگرم خویش را نظارہ کنم

بایں بہانہ مگر روئے دیگر سے بینم

اقبال نے ناقہ بے زمام کو سوئے قطار لانے کے لئے ساز سخن کا بہانہ بنایا تو اس نوا کو بہت

کم سمجھا گیا۔ چنانچہ انہیں کہنا پڑا

زخودر میدہ چہ دانہ فوائے من زکجاست

جہان اودگرست و جہان من دگر است

وہ کسی اور جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا مصرع 'قطرہ خون' سے تھا اور سننے والے حدیثِ دلبری کے منتظر تھے۔ وہ اپنی نگاہ کی گردش سے مستانیز ہر پا کر رہے تھے اور ان کی ملت ایسی مقلع بے بہا کی خریدار نہیں تھی۔ ان کی مخاطب صدیوں سے خوابیدہ ملت تھی جس پر بیداری کے تقاضے بغایت گراں تھے۔ وہ تپکی اور لوری کی طلب گار تھی نہ کہ صویرا سراقیل کی۔

اقبال کا احساس شدید ہوتا گیا۔ ان کا افلاک سیر فکر تقدیر کے پردوں کو چاک کرتا گیا۔ وہ بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ ان کا احساس دو گونہ تھا۔ احساسِ مزہ اور احساسِ تنہا سرائی: چنانچہ جیسا کہ کہا ہے:

از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند      درد یار ہند خوادم کردہ اند

اور

نواز جو صلہ دوستاں بلند تر است      غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچ کس نہ شنید

کم ظرف دوست، رعشہ دار ہمتوں میں فکر اقبال کا ساغر لہرز سنجال سکنے کے اہل نہیں تھے۔ اقبال نے 'مصورِ حق' یہ التجا کی:

مئے من از تنگ جاماں نگہ دار      شراب پختہ از خا ماں نگہ دار

شرار از نیستانے دور تر بہ      بخاصاں بخش و از عا ماں نگہ دار

یہ 'تنگ جاموں' اور 'عوام' کے لئے نہ تھی۔ یہ خراگھا غوثی خلعت سے نکال کر وادی نور الہی کی طرف لے جانے کا ضامن تھا۔ اسے اس نیستان میں ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ملت کی انجمن شعلہ آشاموں سے خالی تھی، یہاں آتش بجا م ساقی کا کیا کام!

۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کو سید سلیمان ندوی کے ہم ایک مراسلہ میں اقبال لکھتے ہیں:

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں، اور نہ میں کسی اپنا رقیب

تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اہل بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں



جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے

ورد

بے مینی خیر ازاں مردے فروست کہ برمن تبت شعرو من بست  
اپنی سے بے درد و صاف کو اقبال نے عمر بھر بے درد و صاف رکھا تا آنکہ وہ وقت آگیا کہ

چورخت خوشیں برستم ازین خاک

تو

مہ گفتند با ما آشنا بود

ولیکن کس نہ دانست این مسافر

چہ گفتو و با کہ گفت و از کجا بود

ارمغانِ حجاز کہ علامہ مرحوم کا آخری مجموعہ کلام ہے آپ کا سفرِ حجاز تھا۔ مادی سفرِ حجاز نہیں بلکہ فزنی دوست کی طرف قلبی سفرِ فزنی حجاز، مرکزِ انسانیت! اور دوستِ معراجِ انسانیت!! اقبال جب بھی فریاد کرتے ہیں تو وہ رسول کا دامن پکڑتے ہیں اور آنکھوں اور دل سے لگاتے ہیں۔ لگتا ہے یا رسول اللہ نگاہ ہے۔ یہی ان کی طمانیتِ روح ہے۔ ان کی آنکھوں کی بھارت، اور قلب کی بصیرت، بصیری کو خواب میں ردائے بخشے والے کے دم سے ہے۔ اقبال بصیری کا خواب کبھی فراموش نہ کر سکے۔ ان کا کلام اس خواب کی تعبیر ہے۔ وہ 'حضور حق' کوئی شکایت نہیں کرتے، وہ 'رسالت' سے ہی داد خواہ ہوتے ہیں اور بیان کی انتہا ہے۔ اس لئے کہ یہ حقیقت ان پر واضح ہے جو کبھی بھی کہ انسانیت کے افراد منتشرہ ایک کا دواں کی شکل، ہمیشہ رسالت کی وساطت سے اختیار کرتے ہیں۔ اس سفر میں بھی وہ حضور رسالت پہنچ کر رسول کے دامن کو وجہ شادابی قلب و نگاہ بناتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ

من اسے میرا دم داد از تو خواہم

مرا پاراں غز لخوائے شمر دند

اقبال کوئی ذاتی خواہش نہیں کرتے۔ انھیں ایک ہی غم ہے اور وہ یہ کہ انھیں مثالِ شاعرانہ افسانہ بست

یوم وفاتِ ملی یادگار قرار دی جائے، شائستہ اعجاز نہ سمجھایا گیا۔ سچ ہے اس سلطنتِ عظمیٰ کے رفیع القدر ایوانوں تک ڈریش و فقیر کی رسائی ناممکن ہے۔ خواہ اس درویش کی فغاں سے کعبہ و سومات تک میں رستائیں اور اس کی نواسے شور سے حرمِ ذات تک میں شور کیوں نہ برپا ہو گیا ہو۔

حکومت کی اس کوتاہی کو البتہ غیر حکومتی حلقوں میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان کے مرکز۔ کراچی۔ میں کسی بزمِ اقبال کی طرف سے یومِ اقبال کے انعقاد کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ ہم بڑے شوق سے منتظر تھے کہ اس تقریب کے پروگرام کی تفصیل سامنے آئے۔ ۲۱ اپریل کے دن میں اس کا پروگرام شائع ہوا ہے۔ وہ وہاں۔

۲۱ اپریل۔ ختمِ قرآن برائے ایصالِ ثواب - ۲۲ اپریل - تقاریر

۲۳ اپریل - قوالی - ۲۴ اپریل - شاعرہ

انا لله وانا الیہ راجعون

قوالی۔ شاعرہ ۱۱ جسے اقبال زندگی بھر قوم کے لئے ایفون قرار دیتے رہے اسی کو ان کی یاد میں روار کھا جا رہا ہے۔ ارمغانِ مجاز میں اقبال نے کہا ہے۔

چورخت خویش بر بستم ازین خاک ہمہ گفتند با ما آشنا بود  
ولیکن کس ندانست این مسافر چه گفت و با کہ گفت و از کجا بود

۱۹۳۸ء سے پیشتر ہی نہیں (کہ وہ ارمغانِ مجاز کا سال اشاعت ہے) بلکہ اس کے دس سال بعد تک بھی اقبال کی یہ بات اسی قدر سچی ہے جس قدر کہ اس وقت تھی۔ ذہنِ ملت کی اس وقت تک یہ کیفیت ہے کہ وہ یہ جان نہیں سکا کہ  
\* این مسافر \*

چه گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اس بزمِ اقبال کے بیشتر افراد شاید اقبال کو ذاتی طور پر بھی جانتے ہوں (صدر بزمِ اقبال، علم الدین صاحب) کہ جن کی طرف سے مذکورہ صدر اشتہار شائع ہوا ہے، کراچی میں گلگڑ ادف کسٹرز ہیں۔ شاید یہ خود بھی انہی کے زمرہ

نے ارمغانِ مجاز میں ایس کی مجلس شوریٰ کے عنوان کے تحت ارشاد ہے۔

طب مشرق کے لئے عوزوں ہی ایفون تھی ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام

میں شامل ہوں جو اقبال کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ اس بنا پر یہ لوگ محفل میں نہایت فخر سے کہتے ہوئے گئے کہ 'بلما آشنا بود؛ لیکن آہ! کتنی افسوسناک ہے یہ حقیقت کہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھا کہ ایک شاعر کی حیثیت سے اقبال کا تذکرہ کرنا اور قولوں کے ذریعے سے ان کی یاد منانا، اقبال سے اظہار عقیدت نہیں بلکہ ان کی روح کو دکھ دینا ہے۔'

ملت کی جبرختی کا کیا ٹھکانا ہے کہ اقبال نے قیصر و کسریٰ کی عظمتیں ان کے قدموں کے نیچے رکھا چاہیں لیکن وہ آب و رنگِ شاعری ہی کے لئے مصری۔ اس نے ظاہری اقبال کو دیکھا اور اس کی حقیقت سے بے خبر رہی۔

کم نظر بے تابی جانم نہ دید  
آشکارم دید و نہانم نہ دید

ملتِ اسلامیہ نے جس روز اقبال کی حقیقت کو سمجھ لیا وہ تاریخِ انسانی کا فیصلہ کن روز ہوگا کہ اقبال کی حقیقت کو سمجھنا دین کو سمجھنے کے مرادف ہے۔ اور اس باب میں ملت کی ابھی یہ حالت ہے کہ

غم ہنوز نداندر روز دیدیٰ در نہ

ورد، آج اقبال کی یاد شاعروں اور قوالیوں کے طاؤس و برباب سے نہ منائی جاتی۔

اور پھر اس سے بھی تلخ تر ہے یہ حقیقت کہ اسلاف کی ہڈیاں، بچکر کھانے والی اس قوم نے اقبال کی یاد کو بھی جلب منفعت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ کراچی میں منعقد ہونے والے یومِ اقبال کی شرحِ مکٹ ۲۵ء، ۲۶ء اور ۲۷ء پر پے مقرر ہے اور مکٹیں زیادہ بیچنے کے لئے یہ جازیت بھی موجود ہے کہ

۲۲ اور ۲۳ اپریل کو قرعہ ڈال کر انعامی مکٹ نکالا جائے گا اور اس مکٹ کے حاصل کی

خدمت میں انعام پیش کیا جائے گا۔

یوں آزاد پاکستان کے مرکزی مقام میں آزادی کے بعد سب سے پہلا یومِ اقبال منایا جائے گا۔ آنے والی نسلیں جب ان چیزوں کو دیکھیں گی تو ہمارے متعلق کیا کہیں گی۔ اس کا اندازہ ہر نگہ حقیقت آشنا لگا سکتی ہے!



۱۰۶ چونکہ کاپیاں پرس میں جلد بھیجی ہیں اس لئے یومِ اقبال کی تفصیل پر بحث نہیں کر سکتے اور نہ جس تقریب کا اشتہار ہے اسکی تفصیل بھی کچھ کم و کچھ نہیں تھی۔ اس مضمون کا مواد جناب پرویز کے اس مضمون سے ماخوذ ہے جو اپریل کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس پر کیا موقوفہ جناب پرویز کے تدریجاً قرآن سے ظہورِ اسلام نے کیا کچھ نہیں سمجھا۔

# صنم خانہ پندار

(ہندوستان کے نظام نو میں مسلمانوں کے ملی شخص کو ختم کر دینے کے منصوبوں کے پیش نظر)

یہ باتیں ہو رہی تھیں بچوں کی ایک مجلس میں  
 کریں گی ہمدلی پیدا نہ تقریریں نہ تخریریں  
 نہیں جب زور کا موقع تو عین مصلحت یہ ہے  
 ہمارے ملک میں جب ہے سبھی کچھ دین پرستی  
 چنیں اسکی عمارت مشرق و مغرب کے سماں سے  
 اسے مرکز بنا دیں ہر جماعت ہر قبیلے کا  
 غرض مندوں کو ہاتھ آجائے گا عذر قد مبوسہ  
 مسلمان بہت نہ پوچھیں گے سوان و اسطے بھی ہم  
 کریں اس خوشنامہ مذہب میں ایسی دل کشی پیدا  
 کہ اطلاق تعافل پر خیال پیش دم رکھیں  
 مناسبہ زبانیں بند کر لیں اور قلم رکھیں  
 اٹھالیں آشتی کا جام اوتخ دو دم رکھیں  
 تو آواک عبادت گاہ کی بنیاد ہم رکھیں  
 کہیں سنگ عرب رکھیں کہیں کھشت عجم رکھیں  
 پرستش کیلئے سب خداؤں کے صنم رکھیں  
 بتوں کے پاؤں میں سرمایہ جاہ و شہم رکھیں  
 صنم خانے کے اندر ایک ٹھوسا حرم رکھیں  
 ہمارے بوہیں اک بار جو اس میں قدم رکھیں

اس کے کان تک پہنچے یہ منصوبے تو وہ بولا  
 جو ممکن ہے تو بیشک نور و ظلمت کو بہم رکھیں

ہیت کہیں گے اور ہم سمجھیں گے کہ ان کی افادیت ہمہ گیر ہے، انھیں طلوع اسلام میں شائع  
 لکھا اور خود قارئین طلوع اسلام سے درخواست کی جائے گی کہ وہ مسئلہ پیش نظر میں اپنے  
 بات سے مستفید کریں تاکہ اس طرح اہل بزم طلوع اسلام میں ایک معنوی رابطہ  
 ہائے کہ "تواصوا بالحق والصبر" (ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کرنے) کی  
 روٹی ہے۔ امید ہے کہ طلوع اسلام کی برادری اس کوشش کو مفید اور دلچسپ پائیگی



طلوع اسلام کے پہلے پرچہ کو دیکھ کر ایک صاحب نے طلوع اسلام کی نشاہ ثانیہ پر  
 دہنیت پیش کرنے کے بعد رقمطراز ہیں۔

محکم دلائل سے مزین و متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ  
 "استقامت" کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے،  
 آپ نے قوم کے ایک بہت بڑے مرض کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری  
 بنیاد پرچکی ہے۔ بیدار و زود سوخ، جلد باز، بات بات پر بگڑ جانے والی۔ کوئی کسی کی بات  
 جوش و خروش اتنا زیادہ اور استقامت اس قدر کم۔ ایک ضرب المثل کے  
 ہماری شیر کی ہوتی ہے اور پچھا رگیدڑ کی بھی نہیں رہتی۔ تقریریں سننے تو ہلاکو  
 کے پتھے چھڑا دیں۔ لیکن اس کے بعد عمل دیکھئے تو کہیں حرکت نام کو نہیں۔ سوال یہ  
 شملہ صفت کیوں ہے؟ کسی ایک دو کی بات ہو تو انفرادی طور پر اس کی تشخیص  
 لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ساری کی ساری قوم (جس میں مستثنیات بالکل نام کو ہیں)  
 کیوں بگڑ رہی ہوئی ہے؟ مجھے تو یہ سوال بہت گہرا اور اہم نظر آتا ہے میں ایک مدت  
 صبر و صبر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ  
 اس قدر اس قدر مغلوب الغضبہ اس قدر شعلہ صفت، اس قدر تیز مزاج کیوں ہوتے ہیں؟ ان کے  
 تیز مزاجی کے ہاتھوں بگڑتے ہیں۔ کسی مسلمان دکاندار سے سودا خریدیے تو ہر وقت اپنی پگڑی کا  
 معلوم یہ کب اسے اچھا لے دے؟ کسی کار بگر سے بات کیجئے تو سیر وقت دھڑکا رہتا ہے

کہ خداخیر کرے، یہ کس وقت گامی دیدے۔ کسی سے معاملہ پڑ جائے تو بہر وقت اندیشہ رہتا ہے کہ نہایت کس وقت بات بگڑ جائے۔ ذرا سی بات خلاف مزاج ہوئی اور یہ آگ بگولہ ہو گئے۔ پھر نہ اپنے نفس کی فکر ہے نہ کسی دوسرے کی عزت کا پاس۔ ہرچہ با داباد! میں پوچھتا ہوں کہ یہ پوری کی پوری قوم اس قسم کی کیوں ہو گئی ہے؟ آپ غور سے دیکھئے۔ مسلمانوں میں قدر مشترک یہی شعلہ مزاجی ہے کہ اس صوبے اور خطے کی تفریق نہیں۔ بچھو کی طرح جس کی پشت پر ہاتھ پھیرے، نیش موجود ہے۔ میں بہت کوشش کی کہ معلوم ہو سکے کہ اس کی علت کیا ہے؟ ڈاکٹروں سے پوچھئے تو وہ شام کہہ دیں گے کہ یہ اعصابی کمزوری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اعصابی کمزوری کبھی ایک فرد میں چاہیے نہ کہ پوری قوم اس طبعی مرض میں مبتلا ہو جائے۔ کوئی اس کی وجہ ان کی اقتصادی حالت بتاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ کہ ان کے دولت مندان کے غریبوں سے زیادہ شعلہ مزاج واقع ہوتے دوسرے یہ کہ دوسری قوموں میں بھی ایسے ایسے غریب لوگ موجود ہیں جو ان سے بھی زیادہ غریب ہیں۔ لیکن وہاں یہ حالت ہے کہ جو زیادہ غریب ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ نرم خو ہو جاتا ہے۔ اسکا اطمینان بخش جواب مجھے آج تک کہیں سے نہیں مل سکا۔ اور یہ سوال میرے دل کو بہر وقت رکھتا ہے کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی بہت سی ناکامیوں کا راز ان کی اس کمزوری میں ہے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس سوال پر پوری طرح سے روشنی ڈال کر اسکا اطمینان بخش جواب تلاش فرمائیں۔

[سوال واقعی بڑا اہم ہے۔ ہم قارئین طلوع اسلام سے درخواست کریں گے کہ وہ اس سوال پر اپنی تحقیق (بلکہ تشخیص) سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ان تمام تشخیصات کے بعد، مرض کی اصل علت دریافت کر لی جائے اور اس کے بعد اس کے ازالہ کی صحیح تدبیر سوچی جائے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیذ انیب۔

# اسراف

تاریخین طلوع اسلام میں سے ایک صاحبِ قلم لڑیں:

پاکستانی اچھوت کے عنوان سے طلوع اسلام کے شمارہ ماہ اپریل میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ان پر ادارہ طلوع اسلام تحسین دشتک کا سختی ہے۔ یہ مروجہ حد علمینان ہے کہ طلوع اسلام جہاں اہم دقیق مسائل کی عقدہ کشائی میں بہتر نظر رہتا ہے وہاں اسکی باریکی میں نگاہیں چھوٹے چھوٹے امور کو کھجی جو نفرتِ اسلامی کے خلاف ہوں نظر انداز نہیں کرتیں۔ الحمد للہ کہ جس بورڈ کے اڈیزاں کئے جانے کے خلاف طلوع اسلام نے قلم اٹھایا تھا، وہ اتار دیا گیا ہے۔

چند روز ہوئے رات کے وقت مجھے کونسل چیمبر اور چیف کورٹ ملڈنگ دکنراچی کے درمیانی چوک میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا جس کے وسط میں گاندھی کا نیم برہنہ نمبر نصب ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ اس مجسمہ سیاہ کے پاؤں میں بجلی کی دو سرچ لائٹس (Search Lights) نصب تھیں جو اس پر روشنی ڈال کر ماحول میں ایک ناقابلِ بیان گھنڈا تان پیداکر رہی تھیں۔ اللہ اللہ! دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت، اور اس کے دارالسلطنت کے مین وسط میں گاندھی کے بت کی یہ عزت و تکریم! میں سٹا میں آگیا۔ پھر فرما ہی مجھے خیال آیا۔ کیا ہمارے محبوب قائدِ اعظم کی تصویر ہندوستان کے چوراہوں یا *Public Places* میں آڈیزاں کئے جانے کی دباں کی حکومت یا عوام اجازت دیں گے؟ یقیناً نہیں۔

ان کے نزدیک تو ہمارے محبوب ہنہ کے فوٹو کا پبلک موقوفوں پر آڈیزاں کیا جانا تو کجا، خود رکھنا یا اس عظیم لیڈر کا عزت و تکریم سے نام لینا اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کے مراد ہے جس سے قتل لازم آئے۔ اور ہم جو بت شکنوں کی اولاد کہہ سکتے ہیں جنہیں تعلیم دی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے دشمنوں کی محبت کو اپنے دل میں کبھی جگہ نہ دیں جو ان کو گمراہ، غارتوں، غنیم کے نقوش قدم پر چلنے کی جستجو کے بلند بانگ عادی کریں، ان دنوں ہم نہ ہوں کہ ہمارے ذریعہ ہتھیار ایک دشمن کلمت کے مجسمے کی یہ عزت افزائی ہو رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں اربابِ حکومت کہ اگرچہ اور لئے ہوئے فریبِ مسلمانوں کی گاندھی پسینے کی کمانی گاندھی کے بت کو روشن کرنے کی ناکام کوششیں بے حریف کے ناکہ ٹنک جائز ہوا ہے۔ اگر کراچی میں برقی قوت کی ایسی ہمارے طور پر تو کیا اس

بہتر بن معرفت یہ نہیں کہ سپانڈہ لیاری کو ایشورنگی تارکیک جھونڈیوں میں روشنی بہم پہنچا دی جائے؟

دیکھتے ہوئے پاکستان کا فکھہ متعلقہ بتاے گا کہ اگر انہیں اس پر اختیار نہیں کہ وہ سٹہ گاندھی کے مجسمہ کو دباں سے الگ کر دیں تو یہ بھی کیا ضرور ہے کہ اسے سرچ لائٹ سے یوں نمایاں کیا جائے! کیا یہ برقی قوت کسی مفید کام میں شمر نہیں کی جاسکتی؟

# جناب کیپ

تشکیل پاکستان کے بعد، محترم قائد اعظم سمیت، تمام ارباب حکومت و اقتدار کی طرف سے اپیلیں ہوئی ہیں کہ پاکستان کے محدود ذرائع پیداوار اور اس کی اقتصادی کمزوری کے پیش نظر، ہر ایک کو کفایت شعاری اور سادگی کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ بالخصوص کپڑے کے معاملہ میں بے حد کفایت کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق کپڑا ہی نہیں کر سکتے۔

یہ اپیلیں ہو رہی ہیں اور اس کا سن کر دوسرے کان سے نکال دی جاتی ہیں لیکن کوئی عملی اجتنام نظر نہیں آتا۔

سوچئے کہ اس کی کیا وجہ ہے۔

ہمارے محترم قائد اعظم نے، تحریک پاکستان میں بھی قوم سے بہت کچھ کہا لیکن اس کا بہت کم اثر ہوا۔ لیکن اس میں سالہ تحریک کے زمانہ میں قائد اعظم نے یہ کیا کہ اپنا ہیٹ اتار کر ایک چھوٹی سی ٹوپی زیب سرفرمالی۔

اس چھوٹی سی ٹوپی میں نہ کوئی آرت کی جاذبیت تھی نہ کسی فیشن کی کشش۔ لیکن ہیٹ والے نے ہیٹ اتار پھینکا۔ ترکی ٹوپی والے نے ترکی ٹوپی الگ کر دی۔ طرہ بازوں نے اپنے طرہ ہائے فلک گیر اتار کر رکھ دیئے اور ہر ایک نے نہایت فخر سے وہی چھوٹی سی ٹوپی سر پر رکھ لی۔

آج وہی چھوٹی سی ٹوپی، ہمارا توئی نشان اور ملی شعارسا بن گیا ہے۔

خوش کیجئے۔ جناب قائد اعظم نے بہت کچھ کہا لیکن کسی نے اس پر عمل نہ کیا۔

لیکن انہوں نے صرف ایک کام کیا اور ہر ایک نے اس کی تقلید کر لی۔

لہذا ظاہر ہوا کہ قوموں میں قوت عمل، وعظ و نصیحت سے نہیں عمل کر کے دکھانے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ اگر محترم قائد اعظم پاکستان کے استحکام کے پیش نظر یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی اختیار کر لیں اور اپنے بال کا بنا ہوا کپڑا استعمال کریں تو یہ چیز ہزار بار کہنے سے حاصل نہ ہوگی۔ صرف ایک بار کرنے سے حاصل ہو جائے گی۔

محترم قائد اعظم، آج کھڑی کا بنا ہوا لباس زیب تن فرمائیں اور وہ کل ہی دیکھیں گے

ساری کی ساری قوم کس طرح اسی کھردرے لباس کو خرید رہی ہے سبھی کھلے سے لگا لیتی ہے۔

جناب کیپ ہم سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ بات کہنے سے نہیں، کرنے سے منوائی جاتی ہے۔